بسم اللہ الرحمن الرحیم

رابطہ ادبِ اسلامی (عالمی) کا

سہ ماہی اُردو ترجمان

کاروانِ ادب

بانی

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ

مدیر مسئول

مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی

مرکزی دفتر رابطہ ادب اسلامی (عالمی)

سہ ماہی **کاروانِ ادب** اسلامی

مجلس مشاورت

مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی، لکھنؤ
مولانا محمود الحسن ندوی، دہلی
مولانا حافظ فضل الرحیم
ڈاکٹر محمود الحسن عارف
مولانا سید محمد واضح رشید ندوی، لکھنؤ
پروفیسر محمد راشد ندوی، علی گڑھ
پروفیسر ظہور احمد اظہر
مولانا محمد سلطان ذوق ندوی

مدیر مسئول

مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی (ناظم شعبۂ برصغیر)

مجلس ادارت

پروفیسر محسن عثمانی ندوی، C.I.E.F.L. حیدرآباد
ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی ندوی، اے، ایم، یو، علی گڑھ
مولانا نذر الحفیظ ندوی، لکھنؤ
مولانا شفیق احمد ندوی جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی
ڈاکٹر سید ضیاء الحسن، لکھنؤ

معاون انتظامی

اقبال احمد ندوی

معاون طباعت

انیس احمد ندوی

طباعت: پاریکھ آفسیٹ پریس، لکھنؤ

کمپوزنگ: ....توفیق ندوی بہرائچی

اس شمارہ کی قیمت.........................-/۴۰ روپے
سالانہ برائے ہندوستان.........................ایک سو پچاس روپے
پاکستان و بنگلہ دیش.........................تین سو روپے یا دس امریکی ڈالر
ان کے علاوہ دیگر ممالک.........................چار سو روپے

چیک یا ڈرافٹ اس نام سے بنائیں.....(RABITAT-AL-ADAB-AL-ISLAMI (INDIA

صدر دفتر رابطہ ادب اسلامی (عالمی) پوسٹ بکس ۹۳ ندوۃ العلماء لکھنؤ

فہرست مضامین

جلد نمبر ۱۴	جنوری تا مارچ ۲۰۰۸ء	شمارہ نمبر ۴

عناوین		صفحہ
منزل بہ منزل	مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی	۴
حمد	ابرار کرات پوری	۶
نعت	ظفر مرادآبادی	۷
حکیم الاسلام کی سخن وری	ڈاکٹر تابش مہدی	۸
بیگمات بھوپال کا زریں عہد اور عربی علوم کی ترقی میں ان کا حصہ	پروفیسر عائشہ رئیس کمال	۲۱
سرونج کی دینی، علمی، ادبی خدمات--ایک جائزہ	محمد متین ندوی	۳۵
مولانا عمران خاں ندوی ازہری: علمی، دعوتی اور اصلاحی خدمات	پروفیسر محمد حسان خاں	۴۴
ریاست بھوپال کے دور اول کے صاحب دیوان اسلامی شاعر	ڈاکٹر جلیل الرحمٰن صدیقی	۶۵
نواب سلطان جہاں بیگم اور ان کی تعلیمی خدمات	ڈاکٹر رضیہ حامد	۸۰
ابوسعید بزمی کی صحافتی و قلمی خدمات	عارف عزیز	۹۱
قتیل۔ باندہ کا ایک نمائندہ شاعر	سید ضیاء الحسن	۹۷
محترمہ طیبہ بی صاحبہ کی علمی و تعلیمی خدمات	ڈاکٹر مرضیہ عارف	۱۱۳
''بس ایک کمرہ''	ذکیہ ظفر	۱۱۷
ادبی و ثقافتی خبریں	اجمل فاروق ندوی	۱۲۲
الاعجاز الصوتي في القرآن الكريم	يوسف محمد الندوي	۱۲۵
قرآن ہے سرچشمۂ فیضان و ہدایت	ڈاکٹر احمد علی برقی اعظمی	۱۳۵

سید محمد رابع حسنی ندوی

منزل بہ منزل

اسلام میں انسانی زندگی کے جائز اور مناسب تقاضوں اور ضرورتوں کا لحاظ کرنے کا اصول رکھا گیا ہے، اور اس کا یہ اصول زندگی کے تمام انفرادی واجتماعی پہلوؤں میں کام کرتا ہے، اس میں انسان کے فطری احساسات کا جو مضرت نہ رکھتے ہوں حق تسلیم کیا گیا ہے، اور صحیح انسانی احساسات کے مطابق آدمی کو اپنا طرز عمل اختیار کرنے کی اجازت ہے، اور اس طرح انسان کے صحت مندانہ احساسات کی ترجمانی، جن الفاظ کے ذریعہ ضرورت ہو، پورا کرنے کی اجازت ہے، انسان کو اپنے اندرون کی اور صحت مندانہ احساسات کی اسلام نے جو اجازت دی ہے، اور اس کو درست سمجھا ہے، اس کے لحاظ سے اختیار کردہ ادب کو انسانی ادب کہا جائے یا اسلامی ادب کہا جائے بات ایک ہی ہوگی۔ اس طور پر انسانی ادب اسلامی ادب ہے، اور اسلامی ادب انسانی ادب ہے، بشرطیکہ انسان کا اختیار کردہ یہ ادب صحت مندانہ انسانی دائرہ سے باہر نہ ہو۔

جب ہم اسلامی ادب کا نام لیتے ہیں تو اس سے عموماً یہی ادب مراد ہوتا ہے، اس میں انسانی دکھ درد، مسرت وخوشدلی، انسانی ہمدردی، محبت ونفرت سب کی جگہ ہوتی ہے، اسی کے ساتھ یہ بات بھی ہے کہ ہم اپنے اس اصول کی بنا پر اس ادب کو انسان کے مفاد میں نہیں سمجھتے جو انسان کے جائز حق اور صحیح رجحان کو نقصان پہونچاتا ہو، اس لیے کہ انسان کو انسانیت کے دائرہ میں رکھنا انسان کی ذمہ داری ہے، خاص طور پر اپنے عمل وکردار میں۔ یہ عمل وکردار خواہ اس کے لیے لذت ولطف کا باعث ہو، لیکن اگر وہ انسان کو اس کے صحت مندانہ دائرہ سے باہر کر دیتا ہو تو اس کو روا رکھنا صحیح نہیں ہے۔

اس طرح اسلامی ادب ایک ضرورت بھی ہے اور ایک فریضہ بھی۔ اس کی دعوت اس وقت ایک اہم ضرورت بن جاتی ہے جب ادب کو صحت مندانہ دائرہ سے باہر کرنے کی کوشش کی جارہی ہو، اور اس میں ایسے حال وقال کی ترجمانی کی جانے لگے جو انسان کو اس کے مقام بلند سے ہٹانے کا ذریعہ بننے لگے، ہندوستان میں جب ایسا پیش آنے لگا تو اس کو بھٹکنے سے بچانے کے لیے اسلامی ادب کی دعوت دی گئی، اسلام چونکہ انسانیت کے مفاد اور اس کے صحت مندانہ تقاضوں کا احاطہ کرتا ہے، اور جس ادب کی وہ دعوت دیتا ہے، وہ انسان کے شایان شان ہے، اس لیے اس کو انسانی ادب بھی کہا گیا ہے، اور اسلامی ادب کی اصطلاح بھی استعمال کی گئی۔ لیکن چونکہ انسان کی حیثیت اور خصوصیت کو مغرب سے آنے والا اشتراکی یا سرمایہ دارانہ، ملحدانہ رجحان انسان کو دوسری مخلوقات کی طرح بلا قید اخلاق و صفات آزاد مخلوق قرار دینے کا تھا، جس سے انسانی اقدار کو ان کے صحیح مقام سے ہٹا کر بے باک وغیر صحت مندانہ دائرہ میں لے جایا جارہا تھا، اس لیے اسلامی ادب کی دعوت کی سخت ضرورت پیش آئی، اور اس کے لیے ادبی صلاحیت کے حامل انسانیت نواز اشخاص کو شاں ہوئے، الحمد للہ اسلامی ادب کے نام سے ان کام کرنے والوں نے اچھی انسانی خدمت انجام دی۔

ہمارا رابطہ ادب اسلامی اسی صحت مندانہ انسانی راہ عمل میں گامزن ہے، اور الحمد للہ وہ بڑی خدمت انجام دے رہا ہے، ہمارا یہ سہ ماہی رسالہ کاروان ادب اسی کا ترجمان ہے، اور زندگی کے نئے نئے موضوعات جو انسانی و اسلامی ادب کے دائرہ میں آتے ہیں، ان کو پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے، یہ ایک اچھی خدمت ہے، اور ہم کو خوشی ہے کہ ہمارا کارواں اسی راہ پر گامزن ہے۔

☆☆☆☆

شعروادب

حمد

ابرارؔ کرت پوری

ہر اندھیارا سن کر پارہ پارہ ہو
حمد کہوں تو محفل میں اجیارا ہو

ہر منظر میں ایماں بخش نظارہ ہو
وقتِ سحر جیسے رب جلوہ آرا ہو

اپنے کرم سے بخش مجھے توفیقِ ثنا
جو بھی حمد لکھوں دل سے، شہ پارا ہو

دھرتی، بحر، خلا، آکاش کو جب دیکھوں
منظر منظر تیرا ہی نظارا ہو

سب کو اس کے آگے جھکنا پڑتا ہے
ہوں مفلس نادار کہ کوئی دارا ہو

یادِ رسول بر حق میں جو آنکلے
ہر آنسو پلکوں پہ روشن تارا ہو

کیوں ابرارؔ نہ سر خم ہو اس کے آگے
ہر جلوہ جب اس کا پیارا پیارا ہو

☆☆☆

نعت

ظفر مرادآبادی

گفتگو آئینہ، دل آئینہ، چہرہ آئینہ
آپ ہر رُخ اور ہر پہلو سے یکتا آئینہ
خامشی بھی معتبر، خوش خلق لہجہ آئینہ
صاحبِ لولاکِ اقدس ہیں سراپا آئینہ
گونج اٹھی ہر طرف اللہ اکبر کی صدا
جب حصارِ کفر میں وحدت کا چمکا آئینہ
باوضو ہونے لگے منظر بھی جیسے ہر طرف
یاد میں جب آپ کی آنکھوں کا بھیگا آئینہ
آپ کی سیرت میں ہیں موجود پہلو نو بہ نو
آپ کا ہر زاویہ، فکر و نظر کا آئینہ
ہیں غبارِ راہ جن قدموں کی روشن کہکشاں
ہے تمنا دید کی، ہوگا وہ کیسا آئینہ
کیوں نہ پھر مقبول ہو، دنیا میں ان کی رہبری
ہر روش پر آپ کا نقشِ کفِ پا آئینہ
ان کی تعلیمات سے جب ذہن و دل روشن ہوئے
منزل حق تک ہوا، ہر ایک رستہ آئینہ
مدحت محبوبِ حق ممکن نہیں ہے اے ظفر
گر تصور میں نہ ہوا ان کا سراپا آئینہ

☆☆☆

ڈاکٹر تابش مہدی

حکیم الاسلامؒ کی سخن وری

حکیم الاسلام حضرت قاری محمد طیب قاسمیؒ (۱۸۹۷-۱۹۸۳) کے تعارف کے ایک دو نہیں متعدد حوالے ہیں۔ جہاں انھوں نے کم وبیش نصف صدی تک ایشیا کی عظیم مذہبی دانش گاہ دارالعلوم دیوبند کی سربراہی کی اور اس کی شہرت ونام وری کو دنیا کے کونے کونے تک پہنچایا، وہیں ایک عارف اور شیخ طریقت کی حیثیت سے بھی وہ بلندترین مقام پر فائز تھے۔ ایک طرف اگر وہ ایک عالم دین کی حیثیت سے پوری دنیا میں ممتاز تھے تو دوسری طرف ایک حکیم ودانش ور کے طور پر بھی وہ جانے اور پہچانے جاتے تھے اور ایک نکتہ شناس متکلم اور بے مثل خطیب ومقرر کے طور پر بھی ان کی حیثیت مسلم تھی۔ مجھے باقاعدہ طور پر ان سے تلمذ کا شرف تو نہیں حاصل رہا، تاہم اس بات کی سعادت حاصل رہی ہے کہ میں نے کئی سال تک ان کی عصری مجالس میں شرکت کی اور ان کی لطیف، شگفتہ اور حکیمانہ باتوں کو سنا ہے۔ اُن مجلسوں میں میرے قلب کو سرور، ذہن کو روشنی اور فکر کو بالیدگی حاصل ہوئی ہے۔ میں جب بھی وہاں سے اٹھا ہوں، مجھے ایسا محسوس ہوا کہ اپنے دامن میں علم و ادب، حکمت ودانائی فہم وبصیرت اور تہذیب وثقافت کی لازوال دولت سمیٹ کر اٹھ رہا

ہوں۔ میں نے ہمیشہ خود کو ان کا شاگرد و نیاز مند محسوس کیا ہے۔ عقیدت و نیاز مندی کا یہ رشتہ ان کی وفات کے بعد ان کے فرزندان جلیل القدر مولانا محمد سالم قاسمی اور مولانا محمد اسلام قاسمی سے بھی قائم ہے۔

یہ بات بہت کم لوگوں کے علم میں ہوگی کہ حضرت قاری محمد طیب قاسمی اپنی جملہ صلاحیتوں اور کمالات کے ساتھ شعر و سخن سے بھی گہری دل چسپی رکھتے تھے۔ ان کے حافظے میں اچھے، تعمیری اور نصیحت آموز شعروں کا بڑا قیمتی ذخیرہ محفوظ تھا۔ انھیں وہ حسب موقع اپنی تقریروں اور تحریروں میں استعمال کر کے سامع یا قاری کو مستفید کرتے تھے۔ بات صرف دل چسپی یا شعروں کو یاد رکھنے تک محدود نہیں تھی، بلکہ وہ خود بھی قادر الکلام شاعر تھے اور عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں انھیں شعر گوئی پر دست رس حاصل تھی۔ شروع میں تو وہ عارف تخلص فرماتے رہے، بعد میں طیب اور قاسمی بھی تخلص کے طور پر استعمال کیا ہے۔ غرض کہ قاری صاحب کی شخصیت کے گوناگوں اور متنوع پہلو ہیں اور ان میں سے ہر پہلو اپنے آپ میں منفرد اور قابل توجہ ہے۔ ان سب کو کسی محدود صفحات کے مقالے میں سمیٹنا اور ان کا حق ادا کرنا کم از کم مجھ ایسے کم علم و بے بضاعت کے لئے ممکن نہیں۔ میں آج کی صحبت میں ان کی شخصیت کے آخر الذکر (شاعرانہ و سخن ورانہ) پہلو کو اپنی گفتگو کا موضوع بناؤں گا۔ حالاں کہ کام یہ بھی مشکل ہے۔ وقت اور صفحات کی تنگ دامنی یہاں بھی حائل رہے گی۔

میں نے قاری صاحب کے مضامین اور مقالے بھی پڑھے ہیں اور ان کی علمی و تحقیقی کتابوں سے بھی استفادہ کیا ہے، ان کے ملفوظات و خطبات بھی سامنے ہیں اور ان کی شاعری بھی دیکھی ہے۔ یہاں یہ بحث اٹھانا مناسب نہیں کہ زیادہ کس چیز نے مجھے متاثر کیا۔ نثر نے، خطابت نے یا شاعری نے؟ لیکن اتنا ضرور عرض کروں گا کہ ان کے ہاں

قاری یا سامع کو سب سے زیادہ جو چیز اپنی طرف متوجہ کرتی ہے، وہ ان کا جمالیاتی اندازِ نظر ہے، اس ذوقِ جمال یا جمالیاتی شعور کا اظہار ان کی علمی و تحقیقی مگر نہایت سبک اور شگفتہ تحریروں اور نثر پاروں میں بھی ہوتا ہے اور موجِ دریا کی طرح نرم ورواں اور باوقار تقریر و خطابت میں بھی اور اس سخن وری میں بھی جسے انھوں نے اپنی زندگی میں مستقل مشغلے کی حیثیت کبھی نہیں دی۔ محض موزونی طبع کے باعث کسی خاص واقعے یا سانحے سے متاثر ہو کر کبھی کبھی کچھ کہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کے مقام و منصب کے لحاظ سے نثر و خطابت کا میدان ہی موزوں اور مناسب بھی تھا۔

جب ہم قاری محمد طیب قاسمی کے مجموعہ سخن ''عرفانِ عارف'' کا مطالعہ کرتے ہیں تو سب سے پہلے ان کے یہ حمدیہ اشعار دامن کشِ توجہ ہوتے ہیں:

خدا کی ذات میں ہے ہر بڑائی
پہنچ سکتی نہیں اس تک برائی
کمالات اُس کے سب دریوزہ گر ہیں
جمالات اُس کے سب زیرِ اثر ہیں
اُسی کا ہاتھ سب ہاتھوں سے اوپر
اسی کی بات سب باتوں سے اوپر

آپ دیکھیں گے کہ ان اشعار میں زبان نہایت سادہ اور روزمرہ کے مطابق استعمال ہوئی ہے۔ اسلوب بھی عام فہم اور شگفتہ ہے۔ کہیں بھی تشبیہات و استعارات کا سہارا نہیں لیا گیا ہے۔ خالص سہل ممتنع کی شاعری ہے۔ ایک لمحے کے لئے بھی اللہ اور اس کے بندے کے درمیان منطق و کلام کی دیوار کھڑی ہوئی نہیں محسوس ہوتی۔ نعت کے یہ اشعار بھی روحانی وجد و کیف کا سبب بنتے ہیں:

اگر ہے سرِّ حق دنیا میں ظاہر
تو مظہر ذاتِ والائے محمدؐ
اگر ہو علم ربانی مصور
تو ہو وہ نقشِ زیبائے محمدؐ
مجسم ہوں گر اخلاقِ الٰہی
تو بن جائے سراپائے محمدؐ
کمالاتِ بشر ہیں ختم ان پر
تو ہے پھر کون ہمتائے محمدؐ

ایک نعت کے صرف چار اشعار ہیں۔ مختصر سی زمین اور عام فہم انداز میں رسالتِ محمدیؐ سے متعلق جتنی بڑی حقیقتوں سے پردہ اٹھایا گیا ہے، وہ حضرت قاری محمد طیب قاسمی جیسے عالم و عارف کا ہی کام تھا، اِن شعروں میں زبان و بیان کا کافی حد تک رکھ رکھاؤ ملے گا اور آں حضور ﷺ کے ساتھ تعلق و شیفتگی کا جذبہ بھی اور با خدا دیوانہ باش، و با محمدؐ ہوشیار کی پاس داری کا احساس بھی۔

اردو شعر و سخن کی دنیا میں ایسے چند ہی نام ملتے ہیں، جو کسی موضوع یا موقعے کی مناسبت سے شعر گوئی پر ہر وقت قادر ہوں۔ اس کے لیے وہ کسی موڈ یا کیفیت کا انتظار نہیں کرتے۔ انھیں اُس موضوع یا واقعے کو نظم کا لباس عطا کرنے میں دیر نہیں لگتی۔ قاری محمد طیب قاسمی کے مجموعۂ سخن کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا نام نامی اس سلسلے کے سخن وروں میں سرِ فہرست ہے۔ انھوں نے مختلف مواقع کی مناسبت سے متعدد نظمیں کہی ہیں۔ بلکہ ان کے مجموعۂ سخن کا غالب حصہ موضوعات اور مواقع کی مناسبت سے نظموں پر مشتمل ہے۔

قاری صاحب کی ایک معرکہ آرا نظم ''اسلام کی روانی'' ہے۔ یہ نظم دراصل اکبر الہ آبادی کی ایک نظم ''پانی کی روانی'' سے متاثر ہوکر انھی کی زمین میں قافیوں میں معمولی سی ترمیم کرکے اسی ردیف میں لکھی گئی ہے۔ اکبر الہ آبادی کی وہ نظم کسی انگریزی نظم کا منظوم ترجمہ ہے۔ اس میں شاعر نے پانی کو مختلف زاویوں سے دیکھا اسے نظم کیا ہے۔ قاری صاحب کی نظم ''اسلام کی روانی'' ماہ نامہ القاسم دیوبند کے ۱۳۳۴ھ کے کسی شمارے میں شائع ہوئی تھی۔ یہ نظم اکبر الہ آبادی کی نگاہ سے گزری تو وہ بہت متاثر ہوے، انھوں نے مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی کے نام اپنے ایک خط میں اس کا خصوصیت کے ساتھ تذکرہ کیا۔ لکھا کہ: ''مولانا محمد طیب صاحب کی نظم ''اسلام کی روانی'' نظر سے گزری۔ ماشا اللہ، صلِ علیٰ، جزاک اللہ، نقاش نقشِ ثانی بہتر کشد زاول۔''

یہ نظم کل ۳۳/اشعار پر مشتمل ہے۔ تمہید کے طور پر صرف ایک شعر ہے:

چلا ارضِ بطحا سے اک بحر ذاخر
کہ تھا جس کی موجوں کا اوّل نہ آخر

عرب کی داخلی صورتِ حال کا نقشہ پیش کرتے ہیں، اسلام کے فروغ اور نہایت تیزی کے ساتھ اس کے دائرے کی وسعت اور پھیلاؤ کو یوں نظم کا جامہ پہنایا ہے:

وہ توحید کی نے بجاتا ہوا — سرودِ حجازی میں گاتا ہوا
ضلالت کے پیڑوں کو ڈھاتا ہوا — زمانے میں اودھم مچاتا ہوا
محیطِ زمیں پر وہ چھاتا ہوا — خباثت کی وسعت گھٹاتا ہوا
صداقت کے جھنڈے اُڑاتا ہوا — وہ باطل کو نیچا دکھاتا ہوا
بتوں سے وہ رشتے تڑاتا ہوا — خدا سے ہر اک کو ملاتا ہوا
جہالت کی رسمیں مٹاتا ہوا — معارف کے ایواں اٹھاتا ہوا

اس سلسلے کے آخر کے تین شعر اس طرح ہیں:

وہ گرتوں کو بڑھ کر اٹھاتا ہوا کہیں ڈوبتوں کو تراتا ہوا
وہ غیروں کو اپنا بناتا ہوا لگن اک نئی سی لگاتا ہوا
وہ آنکھوں سے آنکھیں لڑاتا ہوا دلوں میں ہر اک کے سماتا ہو

اس کے بعد ''بیرونِ عرب'' عنوان کے تحت عرب سے باہر کی توسیعی اور اشاعتی سرگرمیوں کا تذکرہ ہے:

وہ ایوان کسریٰ ہلاتا ہوا علم رومیوں کے گراتا ہوا
چراغِ ہدایت جلاتا ہوا اور آتش کدوں کو بجھاتا ہوا
دوئی سے ہر اک کو بچاتا ہوا سوئے ذاتِ واحد بلاتا ہوا

غرض کہ اسی بہاؤ اور تموج کے ساتھ مختصر انداز میں پوری اسلامی تاریخ اور اس کے فیض و برکات کو اجاگر کیا ہے۔

اکبر الہ آبادی نے اپنے چار مصرعوں کے قطعے میں کہا تھا:

ایک ہی کام سب کو کرنا ہے یعنی جینا ہے اور مرنا ہے
اب رہی بحث رنج و راحت کی وہ فقط وقت کا گزرنا ہے

چوں کہ قاری محمد طیب قاسمی ایک عالم و عارف تھے، دنیا کی کسی چیز سے بے نیازانہ گزر جانا ان کے مزاج و طبیعت کے منافی تھا اور زندگی کی حقیقت اور اس کے مقاصد کا انھیں پورا ادراک تھا، اس لئے انھوں نے اکبر کی بات ادھوری محسوس کی اور چھے مصرعوں کا اضافہ کر کے اکبر کے قطعے کو مکمل کر دیا۔ وہ چھے مصرعے اس طرح ہیں:

رہ گیا عزّ و جاہ کا جھگڑا یہ تخیل کا پیٹ بھرنا ہے
قابلِ ذکر بھی نہیں خورد و نوش یہ بہیمی کی حد سے لڑنا ہے

مقصد زندگی ہے طاعت حق نہ کہ فکر جہاں میں پڑنا ہے

قافیے میں ہلکا سا انحراف ہوگیا ہے، یہاں اس پر گفتگو کی ضرورت نہیں، یہ موضوع دسرا ہے۔ اکبرالہ آبادی نے اپنے مخصوص طنزیہ اسلوب میں ''فجور وتقویٰ'' کے عنوان سے ایک بڑا حقائق خیز قطعہ کہا تھا:

چپکوں دنیا سے کس طرح میں عورت نے کہا کہ گوند میں ہوں
قومی چندے کدھر سمائیں؟ کالج نے کہا کہ توند میں ہوں

قاری صاحب نے قافیہ میں تبدیلی کے ساتھ اسی زمین میں ۳۱/اشعار کی ایک نظم کہی۔ اس میں نفسِ انسانی کی کمزوریوں کے اسباب ولوازم بیان کرتے ہوئے اور ''خیر وشر'' کے چند مقامات کی نشاں دہی کرتے ہوئے۔ ''علم وعمل'' کی اہمیت واضح کی ہے۔ چنانچہ تمام بدیوں، ان کے اسباب اور نیکی وبدی کے بنیادی مرکز کا تذکرہ کرنے کے بعد ''نفس کی علم سے فریاد'' کے عنوان سے تین اشعار میں فرمایا ہے:

کی نفس نے علم سے فریاد آ! ورنہ غبارِ راہ ہوں میں
اس دور کے جہل اور بدی سے افسوس کہ رو سیاہ ہوں میں
نیکی سے ہر ایک لمحہ محروم ہرلحظہ تہ گناہ ہوں میں

پھر ''علم کا جواب اور دعوتِ عمل'' کے عنوان سے نظم کا اختتام کیا ہے، چند شعر آپ بھی ملاحظہ کریں:

گو کوہِ گراں ہوں میں جہاں میں پر تیرے بغیر کاہ ہوں میں
میں پیس کے رکھ دوں ہر بدی کو تو فوج ہو اور شاہ ہوں میں
ہر شر کی چمک کو ماند کردوں تو ہالہ ہو اور ماہ ہوں میں
تجھی سے ہے مری ساری پرواز ہو نہ تو تو پھر تباہ ہوں میں

حضرت حکیم الاسلام کی ایک نظم ہے، ''حکمت وعبرت'' اس میں انسان کے مختلف اعضا کی حکمت اوران سے سبق آموزی کی طرف انسان کومتوجہ کیا گیا ہے۔اس کا صرف ایک شعرآپ ملاحظہ کریں اوردرس ولطف لیں:

خالق کو ناپسند ہے سختی کلام کی
پیدا نہ کی اسی لیے ہڈی زبان میں

حقیقت یہ ہے کہ یہ شعراپنے شاعر کی دنیااوراس کی اشیا کے عرفان کے ساتھ ساتھ خودشاعر کے مزاج وطبیعت کا بھی ترجمان ہے۔ جولوگ قاری صاحب سے قریب رہے ہیں یاجنھیں ان سے کسی بھی نوعیت کا معاملہ پیش آیا ہے، وہ جانتے ہوں گے کہ نرم گفتاری اور نرم مزاجی ان کی خاص شناخت تھی۔حکیم الاسلام قاری محمد طیب قاسمی کی شاعری و سخنوری کے جائزے کے ذیل میں ان کی مشہور نظم ''آنکھ کی کہانی'' کا تذکرہ ناگزیر ہے۔ یہ وہ نظم ہے، جس نے اپنے عہد کے قدآور ناقدوں اورادب فہموں سے اپنے شاعر کی قدرتِ کلام اورسخن ورانہ صلاحیتوں کا لوہا منوایا ہے۔مولانا عبدالماجد دریابادی جیسی یگانۂ روزگار شخصیت نے انھیں دادوتحسین سے نوازا۔اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:

حضرتِ محترم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ!!

''آنکھ کی کہانی'' آں محترم کا عطیہ، یہاں آتے ہی پڑھ ڈالی، سبحان اللہ، ماشاءاللہ! مجھے علم نہ تھا کہ آپ کوشعر پر بھی اس درجہ قدرت حاصل ہے۔

ذالک فضل اللہ

کیا کیا قافیے نکالے ہیں، کیسے کیسے مضمون باندھے ہیں کہ پیشہ ورشاعروں کے بھی چھکے چھوٹ جائیں۔ نہ کہیں جھول، نہ اتنی طویل نظم میں کہیں آورد، بس آمد ہی آمد۔خوش دماغ تو بہ حیثیت ایک سچے قاسم زادے کے آپ تھے ہی، اب معلوم ہوا کہ ماشاءاللہ

خوش فکر بھی اسی درجے میں ہیں۔ ماشاء اللہ

دعا گو دعا جو

۱۵؍ دسمبر ۱۹۶۴ء عبدالماجد

یہ نظم تین حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلا حصہ دائیں آنکھ کے آپریشن کے بعد کے اشعار پر مشتمل ہے، جب کہ دوسرا حصہ بائیں آنکھ کے آپریشن کے بعد کا ہے اور تیسرا حصہ ''شکوہٗ چشم کا اثر اور جوابِ شکوہ'' ہے۔ پہلے حصہ میں ۲۵۰؍ اشعار ہیں، دوسرے میں ۲۴۸؍ اور تیسرے حصہ میں ۲۱۸؍ اشعار، غزل کی ہیئت میں سات سو سولہ اشعار کی یہ نظم حمد کے ان اشعار سے شروع ہوتی ہے:

مستحق حمد و ثنا کا ہے خدائے وہاب
جس نے دی آنکھ ہمیں، آنکھ کو دی نور سے آب
کھول دی چشم بصارت بہ جمالِ ظاہر
جس سے ممتاز نگاہوں میں ہیں خوب اور خراب

نعتِ رسول ﷺ کی سعادت اس طرح حاصل کی ہے:

نعت و توصیف ہے، اس ذات مقدس کے لیے
دل کی بند آنکھ کے جس ذات نے کھولے ابواب

حمد باری تعالیٰ اور نعتِ رسول ﷺ کے بعد صحابہ کرامؓ کی مدح و منقبت بھی منفرد اور اچھوتے انداز میں فرمائی ہے۔ صرف تین اشعار ملاحظہ فرمائیں:

مدحِ اعلیٰ کے ہیں حق دار وہ اصحاب نبی — عقل کو آنکھ ملی، جن سے بہ آیات کتاب
جو ہیں امت کے لئے علم و عمل کا معیار — راہ بینا کی ہے، ان ہی کے رسوم و آداب
چشم دانش کا رتوندہ ہے، جہالت کا ہجوم — سرمۂ عقل ہے خاکِ کفِ پائے اصحاب

حمد باری تعالیٰ، نعت رسول مقبولؐ اور مدح و منقبتِ صحابہ کرام و بزرگان اسلام کے بعد آنکھ کی اہمیت، آنکھ کی افادیت، آنکھ کی افادیت کے مختلف پہلو، آنکھ کے جامع مقامات، آنکھ کی اصلی اور سابقہ کیفیت، آنکھوں میں تغیر، تلاش علاج، معالجے کا آغاز، معالجے کی کیفیت، تعمیر نو، انکشافِ عالم خواب، نتیجۂ علاج، پرہیز اور احتیاط کی بندشیں، تسلی اور اطمینان دہانی، معاون کریم، شکریہ اور دعا، نتیجہ اور خاتمۂ کلام اور تتمہ کلام اور چشمۂ صافی کے عناوین کے تحت دوسو پچاس اشعار پر مشتمل نظم کا پہلا حصہ مکمل کیا ہے۔

انکشافِ عالم خاب، کے ذیل میں صرف تین شعر ملاحظہ کریں:

کس بلا کی تھی یہ پٹی کہ جب آنکھوں پہ چڑھی ہوگیا عالم محسوس بھی کل عالم خواب
وہ ہوئی خواب کی کثرت کہ ذرا آنکھ لگی اور کھلا عالم رویاء وہیں سب خواب بہ خواب
گھٹ گئی نیند مگر بڑھ گئے رویائے منام زیب تن آنکھ کے تھا گویا لباس کم خواب

اس کے بعد ''آنکھ کی کہانی'' کا دوسرا حصہ شروع ہوتا ہے۔اس حصے میں بھی سب سے پہلے حمد الٰہی، ربوبیت کا مقام، ربوبیت مستجمع ہے، ربوبیت اور رحمت، ربوبیت اور مالکیت، ربوبیت اور قہر، ربوبیت اور حفظ ونصرت، ربوبیت اور غناء وعطا، ربوبیت اور صمدیت، ربوبیت اور حلم، ربوبیت کا منشاء معرفت ہے، ہر انقلاب حال پر رب کا سوال، ربوبیت کی جامعیت، حمد جامع اعتراف ربوبیت ہی سے ممکن ہے، حمد ذات وصفات کی ترتیب ربوبیت ہی سے قائم ہے، توحید ربوبیت اور ربوبیت مجازی جیسے عناوین کے تحت حمد رب اور ذکر وشکر رب کا فریضہ ادا کیا گیا ہے۔ربوبیت مجازی کے ذیل میں یہ اشعار سنئے:

یوں تو کہنے کو ہیں ماں باپ بھی رب الاولاد پر کہاں سایہ؟ کہاں اصل کی شانِ نایاب
تربیت ان کی ہے ظلی، تو حقیقی اس کی اب اگر ہیں تو وہ ظلی ہیں بلاریب وریاب

اصل کے سامنے سایہ ہے فقط ایک نمود تابع اصل ہے سایے کا ایاب اور ذہاب
یہ مجازوں کی نمایش ہے حقیقت کا طفیل کشتی ہلتی نہیں جب تک نہ ہلے بحر میں آب

ربوبیت مجازی ہی کے ذیل میں عرف عام، عرفِ خاص، عرفِ فقہ، عرفِ فلاسفہ، عرفِ دہریہ، طبیعت عرض ہے جوہر نہیں، خود پرستی بنام طبیعت، شرک اور تعددِ الٰہ، عقیدۂ مجوس، نور خالق نہیں، مخلوق ہے، مخلوقِ انوار کی مختلف نوعیں اور نورِ نگاہ کی عظمت و اہمیت کے عنوان سے بھی اپنی عالمانہ و متکلمانہ بصیرت کا ثبوت دیتے ہوئے سخن ورانہ فن کاری کا مظاہرہ کیا ہے۔ نعت رسالت پناہی، زمانۂ جاہلیت، ظلماتِ جاہلیت، آفتابِ نبوت کا طلوع، کائناتِ روحانی کا انقلاب، پروردگان نبوت کے اصطلاحی القاب، عالمی پیغمبر اور عالمی قانون، ختم نبوت اور عالمی مدح خوانی اور عالمی نعت جیسے عناوین کے تحت بارگاہِ رسالت میں نذرانۂ عقیدت پیش کرتے ہوئے خالص عالمانہ انداز میں نبوت اور اس کے لوازم کا احاطہ کیا گیا ہے۔ اس سلسلے کو ان دو اشعار پر ختم کیا گیا ہے:

اُن پہ دائم ہوں درود اور ابد تک ہوں سلام جس طرح ان کی شریعت بھی ہے تا یومِ حساب
آنکھ آثارِ نبوت کی رہے دید میں غرق دل محبت میں، زباں صلِّ علیٰ میں غرقاب

اس کے بعد اس شعر سے کہانی کے دوسرے حصے کو نظم کا موضوع بنایا گیا ہے:

اب ہے مقصود کا آغاز پسِ حمد و ثنا
آنکھ کی ہے یہ کہانی جو ہے موضوع کتاب

اور تمہید کے طور پر یہ اشعار پیش کیے گئے ہیں:

شکر صد شکر کہ آج عرصۂ دو سال کے بعد دوسری آنکھ کی بَر آئی امیدِ بے تاب
آ گیا وقتِ سعید اُس کے بھی آپریشن کا اور کھلنے لگے اس کے بھی نگہ کے ابواب
پردے اٹھنے لگے بائیں کے بھی بینائی سے واقعہ بننے لگا اس کی بھی بینائی کا خواب

اس حصے میں شکوۂ چشم کے عنوان کے تحت بائیں آنکھ کے اس شکوے کا تذکرہ ہے کہ صرف دائیں آنکھ کا آپریشن کرا کر اسے محروم بصارت کیوں رکھا گیا؟۔ اس سلسلے میں بائیں آنکھ کی طرف سے شکوے کی مختلف حجتیں اور دلیلیں پیش کی گئی ہیں۔ وہ حجتیں اور دلیلیں تکوینی بھی ہیں اور شعری بھی، شواہد و نظائر کی بھی اور تاثیر و تأثر کی بھی اور ذوق و وجدان کی بھی۔

''شکوۂ چشم کا اثر اور جوابِ شکوہ'' اس طول نظم کا تیسرا حصہ ہے۔ اس کے ابتدائی تین اشعار ملاحظہ کریں:

چشم سازوں نے جو یہ آنکھ کے تیور دیکھے — آ گیا ان کے اِرادوں میں عزیمت کا شباب
ہوگئی فن جراحت میں بھی پیدا حرکت — اس کی جانب جو دلائل کا بڑھایا سیلاب
آنکھ میں آنکھ جو ڈالی تو تأثر سے کہا — ختم ہوں آج سے تاخیر کے سارے اسباب

اس طرح سے یہ حصہ آپریشن کی ضرورت اور وقتی موانع، آپریشن کی حتمی تاریخ اور علیگڑھ کو روانگی، ڈاکٹر گپتا کا خیر مقدم، ہسپتال میں داخلہ، آپریشن کی کامیابی، نعمتوں کی لاتحدیدی، شکر بے حد اور اس سے عجز، اللہ کی نعمتوں کی بے مثالی، شکر بے مثالی اور اس سے عجز، ادائے شکر کی مشکلات کا حل، شکر حقیقی اور اعترافِ نعمت جیسے عناوین کے تحت پایہ تکمیل کو پہنچا ہے۔ آخر میں بعض شخصیتوں کے تعاون اور توجہ کے سلسلے میں ان کا شکریہ بھی ادا کیا گیا ہے۔ ان میں مولوی محمد حسن، مولوی کرار حسین، ڈاکٹر حفیظ الرحمٰن، موہن للت شرما، مسز اے. لال.، ڈاکٹر ایم. کے. گپتا اور ہسپتال کے بعض دوسرے عملے خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ حیرت اس بات کی ہے کہ یہ پوری سات سو سولہ اشعار کی پابند نظم کہیں بھی اس تاثر کا دامن ہاتھ سے جانے نہیں دیتی جو اس کے ابتدائی اشعار میں قائم ہوتا ہے۔ پوری نظم یکساں فضا اور ماحول میں تخلیق پزیر ہوئی ہے اور آخر تک یکساں کیف و تأثر

بھی باقی رہتا ہے۔ یہ کسی شاعر کے فن پارے کی بہت بڑی خوبی ہے۔

''عرفانِ عارف'' کی بعض دوسری نظمیں بھی اپنے اندر وہی کیف ولذت رکھتی ہے۔ جسے کسی بڑے شاعر کی کسی بڑی تخلیق کے لیے ناگزیر تصور کیا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں ان کی نظموں میں سپاس وتشکر، سپاس واخلاص، خیر مقدم، نوحہ غم ونغمۂ شادی، تہنیت سالگرہ مہاراج شیر سنگھ والی ریاست راج پوتانہ، شکریہ سلطان العلوم نظام دکن، خروش جگر، ذکر محمود، مسدس کوثر العلوم، مرثیہ حضرت نانوتوی، نالہ دل اور آہِ دردِمنداں کے ساتھ ساتھ دعاے پدر، دعوتِ آم، کیلا، دعوتِ چاے اور مقصدِ زندگی کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا جانا چاہئے۔

حقیقت یہ ہے کہ حکیم الاسلام قاری محمد طیب قاسمی ایک عالم دین، عارف باللہ، متکلم اسلام اور داعی حق کے ساتھ قادر الکلام، فن شناس اور پر گو شاعر وسخن ور بھی تھے۔ انھوں نے شاعری برائے شاعری نہیں کی ہے۔ بلکہ اپنی اس فطری اور وہبی صلاحیت سے انھوں نے حکمت ودانائی کے موتی بکھیرے ہیں، ضرورت اس بات کی ہے کہ ہمارے ناقدین اور ادب فہم حضرات ان کی سخن وری کو اپنی تنقید کا موضوع بنائیں اور اردو شعر وادب کی تاریخ کے تناظر میں اس کی تعیین قدر کریں۔ یہ شعر وادب کی ایک بڑی خدمت ہوگی۔

☆☆☆☆

پروفیسر عائشہ رئیس کمال

بیگمات بھوپال کا زریں عہد

اور

عربی علوم کی ترقی میں ان کا حصہ

بھوپال ایک چھوٹی سی ریاست تھی، جس نے بہت بڑے بڑے کام انجام دیے۔ یہاں کے نوابوں اور خاص طور پر بیگمات نے اس ریاست کی ہمہ جہت ترقی کے لیے اہم اقدامات کیے۔ خاص طور پر اسلامی ثقافت کی ترقی میں زبردست اور اہم رول ادا کیا۔ اگر یہ کہا جائے کہ ہندستان کی تاریخ میں یہ واحد ایسی ریاست تھی جس میں انیسویں صدی سے بیسویں صدی کی ابتداء تک چار بیگمات نے مسلسل حکومت کی۔ یہ ایسی نادر بات ہے، جس کی دنیا میں کہیں کوئی مثال نہیں ہے۔ زیر نظر مقالے میں مختصر طور پر ان کے عظیم علمی اور اصلاحی کاموں پر روشنی ڈالی جائے گی۔ کیونکہ یہ بھوپال کی تاریخ کا ایک روشن اور درخشاں باب ہے۔

بھوپال شہر اپنی ایک الگ شناخت کے سبب آزادی کے بعد مدھیہ پردیش کی راجدھانی بنادیا گیا۔ یہ ریاست اپنے علمی وثقافتی اور رفاہی کارناموں کی وجہ سے بہت مشہور ہے۔ نوابوں کے زمانے میں ریاست قائم کرنے اور مضبوط رکھنے کے لئے کوششیں جاری تھیں اور اسی لئے جنگ وجدال کی کیفیت تھی لیکن بیگمات کے عہد میں اور خاص طور پر جب یہ ریاست برطانوی حکومت کے تحت آگئی جنگ وجدال تھم گیا۔ مساجد، مکاتب اور مدارس قائم ہوگئے۔ علماء نے مختلف علاقوں میں قائم شدہ مدارس کی ذمہ داریاں سنبھال لیں اور اسلامی شریعت وشعائر تمام اطراف میں عام ہوگئے۔

بیگمات بھوپال نے صرف علم وادب کی طرف ہی توجہ مبذول نہیں کی بلکہ صناعت، زراعت، باغات کی طرف بھی دھیان دیا اور ان کی حفاظت کے انتظامات کئے۔

بھوپال ریاست کی خاص بات یہ تھی کہ بیگمات کا غیر مسلموں کے ساتھ نیک سلوک تھا، جس کے سبب امن وامان وعافیت قائم تھی اور آپس میں بھائی چارہ تھا کسی طرح کا آپس میں اختلاف نہیں تھا۔ ریاست میں فکر وعقیدے کی آزادی تھی اور آپس میں ایک دوسرے کے مذہب کا احترام کیا جاتا تھا، جس کا عوام میں بہت اچھا اثر تھا اور ہر ایک کو اپنے دین وعبادت کی آزادی تھی اور یہ بھائی چارہ آزادی کے بعد تک قائم رہا۔ بلکہ آج بھی قائم ہے۔ یہ ہمارے پُرانے بزرگوں کے انصاف ومساوات کا بدلہ ہے جس کو ہم آج تک محسوس کررہے ہیں۔

جب ہم اس مسلم ریاست کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ سلطان جہاں بیگم کے عہد تک بیگمات نے اس ریاست پر حکومت کی اس سے پہلے نوابوں کی حکومت کے دوران بھی خواتین نے اہم رول ادا کیا تھا اور اس ریاست کی ترقی میں ان کا بڑا ہاتھ تھا جیسے فتح بی بی، ماجی مولا، صالحہ بیگم وغیرہ۔

قدسیہ بیگم نواب غوث محمد خاں کی بیٹی تھیں۔ ۱۷۹۹ء میں پیدا ہوئیں۔ جب ان کی عمر ۱۵ برس کی تھی نواب نظر محمد خاں سے ان کی شادی ہوگئی۔ شادی کے ۱۹ مہینے بعد بیٹی نے آنکھیں کھولیں۔ جس کا نام سکندر جہاں رکھا۔ شادی کے دو سال بعد جب وہ صرف ۱۷ سال کی تھیں شوہر نامدار داغ مفارقت دے گئے۔ شوہر کی وصیت کے مطابق کہ جوان کی بیٹی سکندر جہاں سے شادی کرے گا وہ بھوپال اسٹیٹ کا حاکم ہوگا۔"(۱)

انگریزوں نے قدسیہ بیگم کے خلاف پوری ایک لابی تیار کرلی، لیکن پورے معاملہ کا دارومدار سکندر جہاں بیگم کی شادی پر موقوف ہوگیا۔ سادگی کے ساتھ ان کی شادی جہانگیر محمد خاں سے کردی گئی، انھوں نے عہد و وفا کا وعدہ کیا۔ مگر کچھ ہی دن بعد تمام عہد و پیماں بھول گئے اور قدسیہ بیگم و سکندر جہاں بیگم کے خلاف بغاوت شروع کردی۔ لیکن ان کی یہ کوشش ناکام ہوگئی۔

۱۸۳۷ء میں جہانگیر محمد خاں اور قدسیہ بیگم کے درمیان آٹھا میں جنگ چھڑ گئی اور قریب تھا کہ قدسیہ بیگم کو فتحیابی حاصل ہوتی، اسی درمیان انگریزوں کی مداخلت سے جنگ رُک گئی اور قدسیہ بیگم پر دباؤ ڈالا گیا کہ وہ حکومت سے دستبردار ہو جائیں۔ اس کے بعد لے ۴ لاکھ روپے سالانہ ان کو دئے جایا کریں گے۔(۲)

قدسیہ بیگم کو جو وراثت میں اعلیٰ وارفع مقام، استقلال اور شجاعت ملی تھی اس کی وجہ سے وہ نا امید نہیں ہوئیں بلکہ دوبارہ حکومت حاصل کرنے کے لئے برابر کوشش کرتی رہیں۔ لیکن وہ اپنی کوششوں میں ناکام ہوتی گئیں۔ یہاں تک کہ ۲۸ ذی قعدہ ۱۲۶۰ھ میں ۶۲ سال کی عمر میں جہانگیر محمد خاں کا انتقال ہوگیا۔

قدسیہ بیگم کی پوری زندگی ایک مہذب خاتون کی زندگی نظر آتی ہے۔ دن میں روزہ رکھتیں اور راتوں کو عبادت میں گذارتیں۔ آپ اپنی مالداری کا فائدہ صرف خود نہیں اٹھاتی

تھیں بلکہ جو غرباء سائل بن کر آتے یا ان کو ان کی ناداری کا علم ہوتا سب کی مدد کرتی تھیں۔ اور کبھی کبھی تو ایسا اتفاق ہوتا کہ ضرورت مندوں کی مزاج پُرسی کرنے خود جاتیں اور ان کی ضرورتیں پورا کرتیں۔ خاص طور پر آپ مکہ شریف و مدینہ شریف کے عرب فقراء کا بہت خیال رکھتیں اور اپنی سخاوت کے دروازے ان کے لئے کھول دیتیں۔ جب آپ حج بیت اللہ کے لئے گئیں تو وہاں حجاج کرام کے لئے رباط تعمیر کرائی جو آج تک موجود ہے اور بھوپال کے حاجی اس سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ ان کا عہد بہت روشن تھا اور تفکیر بہت وسیع تھی۔ ۲۷ر دسمبر ۱۸۸۱ء کو شام کے وقت اس دار فانی سے رحلت فرما گئیں۔

ان کا سب سے عظیم کارنامہ بھوپال کی ''جامع مسجد'' ہے جو ان کی عظمت کو آج بھی ظاہر کرتا ہے۔ اپنی رعایا کے ساتھ وہ انصاف کا معاملہ بغیر تفریق و تمیز کے کرتی تھیں۔ بہت متقی و پرہیز گار والیہ تھیں۔

سکندر جہاں بیگم:

۱۲۳۳ھ میں پیدا ہوئیں بچپن میں ہی والد ماجد کا سایہ سر سے اٹھ گیا ان کی والدہ ماجدہ نے ان کی تعلیم و تربیت پر خاص توجہ کی اور ان کے زمانہ کے مشہور علماء سے درس و تدریس کا کام لیا۔ اور فوجی و سیاسی تعلیم کا بھی خاص اہتمام کیا۔

ان کے والد کی وصیت کے مطابق کہ عورت حکومت کے معاملات کو اچھی طرح نہیں سنبھال سکتی جب تک وہ عسکری اور سیاسی تعلیم سے آراستہ نہ ہو اور اسی مناسبت سے ان کی شادی ایسے شخص سے کی جائے جو حکومت کے معاملات کو پوری طرح سنبھال سکے۔

اپنی بہادری، سمجھ بوجھ اور مہارت کے سبب اخیر میں فوجدار محمد خاں (جو سکندر جہاں بیگم کے ماموں تھے اور شاہجہاں بیگم کی کم سنی کے سبب ان کے قائم مقام تھے) کو حکومت

سے دست بردار ہونا پڑا۔ سکندر جہاں نے ۱۵؍محرم ۱۲۶۳ھ کو حکومت سنبھالی۔ اپنی مقدور بھر کوشش و توجہ کی۔ اس طرح ان کی دیرینہ خواہش پوری ہوئی اور وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوئیں۔ اپنی بیٹی شاہجہاں کے لئے ایک مستقل پرسکون اور متحد ریاست اپنے بعد چھوڑی۔

یہ پہلی والیہ بھوپال تھیں جس نے اسکولوں میں اُردو، فارسی، عربی، ہندی اور انگلش کی تدریس کا اہتمام کیا اور اسی طرح مختلف علاقوں میں ہسپتال اور صحت عامہ کا خاص اہتمام کیا۔

۱۳ سال قائم مقام والیہ ریاست رہنے کے بعد ۹؍شوال ۱۲۷۶ھ میں مستقل والیہ ریاست ہوگئیں۔ ریاست بھوپال کی تاریخ میں ان کا دور بہت روشن و تابناک ہے۔ وہ ہمیشہ اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کرتیں اور ان کو پورا کرنے میں حتی الامکان سرگرداں رہتیں۔ جس طرح انھوں نے خارجی سیاست کا اہتمام کیا اسی طرح داخلی اصلاحات بھی نافذ کیں۔ جبلپور، الہ آباد، آگرہ وغیرہ کا سفر کرکے وہاں کی ادبی و اصلاحی محفلوں میں شرکت کی اور بہت سے دیگر ملکوں کے سفر کے دوران علماء و فضلاء سے مختلف موضوعات پر تبادلہ خیال کیا۔ بھوپال کی مشہور، خوبصورت اور عالیشان مسجد "موتی مسجد" کے نام سے بنوائی۔ ۱۵۰۰؍اشخاص کو اپنے اخراجات پر حج بیت اللہ لے کر گئیں۔ اور حقیقت میں یہ ثابت کردیا کہ ایک مسلم حکمراں عورت اپنی سمجھ، بہادری، معاملہ فہمی کے سبب تمام کام بخوبی انجام دے سکتی ہے۔ سکندر جہاں بیگم نے دوسری شادی منشی جمال الدین سے کی۔ وہ ان کے اور شاہجہاں بیگم کے زمانہ میں وزیر اعظم رہے اور حکومت کے اہم کام سرانجام دیئے۔ منشی جمال الدین نے اپنی اصلاحی تقریروں کے ذریعہ بھوپال کے سیاسی و سماجی احوال کی زبردست اصلاح کی۔ (۳) ان کی ۵۳ سالہ زندگی جدوجہد، عقلمندی اور سمجھداری کے کاموں سے عبارت ہے۔ ان کا انتقال ۳۰؍اکتوبر ۱۸۶۸ء

میں ہوا۔

شاہجہاں بیگم:

۳۰ر جولائی ۱۸۳۸ء کو قلعہ اسلام نگر میں پیدا ہوئیں۔ اپنی ماں سکندر جہاں کے سایہ عاطفت میں پرورش پائی۔ ان کی والدہ نے ان کی دینی تعلیم کے لئے معروف و مشہور علماء کو منتخب کیا۔ لشکری، فوجی اور سیاسی تعلیم و تربیت کے لئے بھی بہت اچھے انتظامات کئے۔ ان سب کے علاوہ وہ خود عقلمند و ذہین تھیں۔ حافظہ اتنا قوی اور وسیع تھا کہ بہت جلد ہی ہر بات کو سمجھ کر فوراً حفظ کر لیتی تھیں۔

اپنے والد کے انتقال کے بعد ان کی وصیت کے مطابق شاہجہاں بیگم والیہ ریاست ہوئیں۔ لیکن وہ اپنے اقتدار سے خود ہی دست بردار ہوئیں اور حکومت کی لگام اپنی والدہ کو سونپ دی۔ ان کی والدہ نے ۹ سال حکومت کرنے کے بعد ۱۸۶۸ء میں انتقال کیا۔ اس کے بعد شاہجہاں بیگم نے ۳۳ سال تک حکومت سنبھالی اور ۱۹۰۱ء میں انتقال فرمایا۔

شاذ و نادر ہی اس کی مثال ملتی ہے کہ کوئی حکمراں دوسروں کی خاطر اپنا اقتدار چھوڑ دے۔ جب وہ ۱۷ سال کی تھیں تو بیوہ ہو گئیں۔ ۳ سال اسی طرح گذارے پھر وزیر اعظم جمال الدین نے دوسری شادی کا مشورہ دیا انگریز حکومت نے بھی دوسری شادی کو کہا، اس طرح جلیل القدر عالم و مشہور مصنف علامہ سید صدیق حسن خاں سے ۸ر مئی ۱۸۷۱ء کو ان کا نکاح ہوا۔ انگریزوں نے ان کو نواب والا جاہ امیر الملک سید محمد صدیق حسن خاں بہادر کا خطاب عطا کیا۔ (۴)

۱۸۹۰ء میں وفا شعار شوہر کا ۲۶ سال ساتھ رہنے کے بعد وصال ہو گیا اور وہ دوبارہ بیوہ ہو گئیں۔ اور غیر مسلموں کی رسم کا اس مبارک شادی سے خاتمہ ہوا کہ جو مطلقہ یا بیوہ عورت کی دوبارہ شادی کی مخالف تھی (۵) شاہجہاں بیگم کے خاندان والے اس شادی

سے خوش نہیں تھے۔

والیہ بھوپال شاہجہاں بیگم کی نواب صدیق حسن خاں کے ساتھ شادی خود ان کے لئے اور اہل بھوپال بلکہ پورے ہندوستان کے لیئے خیر و برکت کا ذریعہ بنی۔ بیگم کا مال و اقتدار اور نواب صاحب کا علم اور علماء کی ترقی کے لئے خیر ہی خیر کا سبب بنا اور بھوپال ریاست علم کا گہوارہ بن گئی، اہم کتابوں کی طباعت ہونے لگی اور بڑے بڑے علماء کرام اس دیار کی طرف ہجرت کرنے لگے۔ حدیث و تفسیر کی بہت سی اہم کتابوں کے علاوہ دوسری اہم کتابیں بھی اپنے ذاتی مصارف سے طبع کرائیں۔ نواب صاحب اس سلسلے میں بیگم صاحبہ کی برابر علمی مدد و نصرت کرتے۔ علامہ عبدالحی حسنی مرحوم اپنی مشہور کتاب ''نزہۃ الخواطر'' میں یوں رقم طراز ہیں:

''نواب صدیق حسن خاں کی علمی خدمات لائق تحسین ہیں۔ انھوں نے علم حدیث اور سلف کی کئی نادر کتابیں جمع کیں اور طباعت میں بہت مال خرچ کیا ان نادر کتابوں میں تفسیر ابن کثیر، فتح البیان، ابن حجر عسقلانی کی فتح الباری بھی ہے، جس کا قلمی نسخہ حدیدۃ سے خریدا جو ابن علان کا تحریر کردہ تھا اور مصر میں بولاق پریس میں چھپوایا، اس وقت اس کو چھپوانے میں ۵۰ ہزار روپیہ خرچ کیے گئے تھے اور اس کو علم کے شائقوں کو ہدیہ کیا۔ پہلی طبع پر یہ تحریر ہے کہ شاہجہاں بیگم نے اپنے ذاتی مصارف سے چھپوا کر ہندوستان اور بیرون ہند میں تقسیم کرایا۔''(۶)

مولانا مسعود عالم ندوی، علامہ رشید رضا مصری کی کتاب ''مفتاح کنوز السنۃ'' کے مقدمے سے نقل کرتے ہیں:

''اگر ہندوستانی علماء کی علم حدیث کی طرف خاص عنایت و توجہ نہ ہوتی تو

مشرق کے علاقوں میں اس فن پر زوال آجاتا۔ کیونکہ مصر، شام، عراق اور حجاز میں دسویں صدی سے ۱۴ویں صدی کے شروع تک اس علم کی تدریس، تدوین وترویج میں بہت کمزوری پیدا ہوچکی تھی۔"(۷)

دوسرے مصری عالم شیخ عبدالعزیز الخولی فرماتے ہیں:

"اس وقت دنیا کے لوگوں میں کوئی قوم ایسی نہیں جس نے سوائے ہندوستانی مسلمانوں کے حدیث کی ذمہ داری سے خدمت کی ہو۔ ان کے یہاں حدیث کے حفاظ بھی بہت ہیں۔ وہ لوگ حدیث اس طرح جس طرح کہ تیسری ہجری میں پڑھی جاتی تھی۔ ان کے بڑے علماء میں شاہ ولی اللہ دہلوی ہیں، جن کی سب سے مشہور کتاب "حجۃ اللہ البالغہ" ہے۔"(۸)

شاہجہاں بیگم کے علمی واصلاحی کاموں کی ایک لمبی فہرست ہے، جن کا مکمل تذکرہ کرنا اس مقالے میں ناممکن ہے تاہم مختصراً تذکرہ پیش خدمت ہے۔

۱۔ عصری تعلیم کے ساتھ ساتھ دینی تعلیم کو بھی لازمی قرار دیا۔ قرآنی تعلیم کے لئے اپنے والد کے نام پر "جہانگیریہ" اسکول قائم کیا۔

۲۔ شاہجہانی پریس کی بنیاد رکھی تاکہ اس میں نادر ومفید کتابوں کی طباعت ہو سکے۔ اس پریس میں نواب صدیق حسن قنوجی اور شاہ ولی اللہ دہلوی کی کتابوں کی طباعت عمل میں آئی۔ اس کے علاوہ نیل الاوطار اور دیگر اہم کتابیں شائع کیں۔ جس سے اسلامی علوم اور صحیح عقائد کا رواج ہوا۔(۹)

آپ کو عمارتیں بنوانے کا بھی بہت خاص شوق تھا۔ یہ ان کی خصوصیت تھی، تاج محل، عالی منزل، بے نظیر محل اس کی بہترین مثالیں ہیں۔

تاج محل نادر یادگاروں میں سے ہے۔اس میں آپ نے اپنی زندگی کے بہت اچھے دن گزارے۔اس میں کئی کمرے ہیں اور ہر کمرے کا الگ الگ رنگ اور اس کی مناسبت سے اس کا فرنیچر ہوتا تھا۔اس کا دروازہ اتنا بڑا عالیشان ہے کہ ہاتھی کی بگھی اس میں آسانی سے گھوم سکتی تھی۔اسی طرح ''ساون بھادوں'' کے نام سے ایک پارک اور تفریح گاہ بنوائی۔

عالی منزل: یہ عالیشان بلڈنگ جس میں ۶۴ محرابیں اور وسیع میدان، بڑے بڑے درخت اور پھولدار پودے ہیں ان کے مغربی جانب عورتوں کے لئے ''پری بازار'' کے نام سے ایک خاص بازار بنوایا تھا۔

بینظیر محل: جیسا کہ اس کے نام سے ہی ظاہر ہے کہ اس کی کوئی دوسری نظیر نہیں۔یہ آج بھی اپنے بانی کی عظمت کو عیاں کرتا ہے۔

شاہجہاں آباد: یہ ایک خوبصورت محلہ ہے جس کے پلاٹوں کو بیگم نے لوگوں کو مفت تقسیم کیا تھا اور مالی مدد دی تا کہ لوگ اپنے مکانات بنا کر اس میں رہیں۔اسی طرح ایک دوسرا محلہ ''نور محل'' کے نام سے خاص طور پر بنوایا۔

وہ جگہ جہاں اللہ کو سجدہ کیا جاتا ہے اور جس کو دین اسلام میں خاص نام سے پکارا جاتا ہے، وہ مسجد ہے ایسی ہی ایک عظیم مسجد بنانے کا انھوں نے ارادہ کیا اور تاج المساجد کی تعمیر کرادی۔یہ مسجد ان کی عظمت کی ایک جیتی جاگتی اور بولتی تصویر ہے اس کو بنوانے کے لئے آگرہ سے پتھر منگوائے گئے تھے اور علاقہ کے پتھر بھی استعمال کئے گئے۔اس عظیم مسجد کا سنگِ بنیاد بیگم شاہجہاں نے ۲۹ محرم ۱۳۰۵ھ (مطابق ۱۸۸۷ء) کو رکھا۔یہ ہندوستان کی سب سے بڑی اور خوبصورت مسجد ہے جو دہلی کی جامع مسجد کے مشابہ ہے اس کی عمارت تین منزلہ ہے۔

یہ اسلامی ریاست ان کے عہد میں مدرسوں، اداروں اور مسجدوں سے بھری پڑی تھی

اور یہ اس ریاست کی خوش نصیبی تھی کہ منشی جمال الدین جیسا عالم باعمل وزیر اعظم اس کو ملا اور دوسرا وہ نامور عالم جس کی شہرت نہ صرف مشرق ومغرب میں بلکہ پورے عالم میں تھی اوران کے علم وفضل کا لوہا عرب وعجم ہر جگہ مانا جاتا تھا۔ جن کی ۳۰۰ سے زیادہ عربی، فارسی اور اردو کتابیں ہیں۔ یہ وہی نواب صدیق حسن خاں ہیں جن سے شاہجہاں بیگم نے ان کی علمی قابلیت سے متاثر ہو کر شادی کی جس کی وجہ سے بھوپال ریاست کو بہت فائدہ ہوا۔ اس طرح ریاست خوش بخت ہوئی۔

ایک بڑے عرب عالم حسین بن محسن انصاری خزرجی یمنی کی آمد سے بھی بہت نفع ہوا، جو ایک واسطے سے علامہ شوکانی کے شاگرد تھے، جن کے سبب ہندوستان میں ''علم حدیث'' نے کافی ترقی کی۔ شیخ حسین بن محسن لحیۃ (حدیدہ) شہر میں قاضی تھے۔ ان میں اوران کے علاقہ کے نواب میں کچھ اختلاف ہوا تو وہ اپنے وطن کو خیر باد کہہ کر ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے زمانہ میں ہندوستان تشریف لے آئے۔ آپ سکندر بیگم کے زمانہ میں آئے تھے۔ ۲ سال قیام کے بعد اپنے وطن لوٹ گئے تھے۔ اس کے پانچ سال بعد شاہجہاں بیگم کے عہد حکومت میں بھوپال آئے ۴ سال بعد پھر واپس چلے گئے۔ اس کے ۵ سال بعد بھوپال آکر مستقل سکونت اختیار کر لی (۱۰)۔ شاہجہاں بیگم کے عہد حکومت میں بھوپال علم کا گہوارا تھا اور خاص طور پر علم حدیث پر بہت کام ہوا۔

حکومت کا مالی نظام صحیح طریقہ پر چل رہا تھا، ان کا عہد رفاہیت اور سکون سے پُر تھا۔ ریاست کے تعلقات دوسری ریاستوں اور مرکز سے بہتر تھے، حقیقت میں ان کے دور کو ایک کامیاب اور مثالی دور کہا جا سکتا ہے۔

آپ کی تصنیفات: شاہجہاں بیگم اپنی فضیلت، ادب، بلند علمی مرتبہ، سخاوت، شجاعت اور ان گنت مصروفیتوں کے بعد بھی ایک عظیم شاعرہ اور ماہر مصنفہ تھیں، آپ

شاعری تاجور اور شیرین کے نام سے کرتی تھیں، آپ کی کتابیں تہذیب الاخلاق اور خزینۃ اللغات ہیں۔آپ کے دیوان درج ذیل ہیں: دیوان شیریں، مثنوی صدق البیان اور مثنوی تاج الکلام۔

سلطان جہاں بیگم: آپ جولائی ۱۸۵۸ء میں موتی محل بھوپال میں پیدا ہوئیں، وہ چوتھی بیگم تھیں جنھوں نے تسلسل سے بھوپال پر حکومت کی، ان کے زمانے میں ریاست نے دین وعلم کے میدان میں بہت اہم رول ادا کیا، آپ نے شاجہاں بیگم کے ذریعہ شروع کئے گئے بہت سے کاموں کو مکمل کیا، سوائے تاج المساجد کی تکمیل کے جس کی تکمیل کا سہرا خدا تعالیٰ نے مولانا محمد عمران خان ندوی ازہری مرحوم کے لئے مقدر کر رکھا تھا، اس کے علاوہ انھوں نے ترقی کے نئے نئے منصوبے شروع کئے اور ان کو تکمیل تک پہنچایا، ان کے عہد میں فکری، دینی اور ادبی تحریک بہت کامیابی سے آگے بڑھی اور علم کے تمام شعبوں میں مطالعہ عام ہوا اور اس طرح یہ ریاست علم و ادب والوں کا مرکز بن گئی، بڑے بڑے علماء نے بھوپال کی طرف کوچ کیا اور اپنے ساتھ علمی خزانے بھی لائے، لائبریریاں قائم کرنے کا رجحان بڑھا اور نادر کتابوں کے حصول کے لئے مقابلہ آرائی میں اضافہ ہوا اور بھوپال علوم کے مطالعہ کا ایک بہت اہم مرکز قرار پایا۔

اس ریاست میں قضاء شرعی، مساجد اور اوقاف عام وخاص کے محکمے تھے اور کئی مدرسے قائم کئے گئے تھے، جن میں تفسیر، حدیث، فقہ، دین اور حفظ قرآن وتجوید کی تعلیم دی جاتی تھی، ایک شعبہ تالیف وتصنیف کا بھی تھا اور کئی پریس تھے جن پر حکومت بجٹ سے ایسے ہی خرچ کرتی تھی جس طرح حکومت کے دیگر کاموں پر اخراجات کئے جاتے تھے۔اس ریاست کی علمی و دینی شعاعوں کے نتیجے میں ریاست اور بیرون ریاست میں دینی وثقافتی ماحول پیدا ہوا۔

تعلیم وتربیت: ان کی تعلیم وتربیت آپ کی نانی سکندر جہاں بیگم نے کی۔وہ تزک سلطانی میں خود تحریر کرتی ہیں کہ:

''میں نے ۱۱رسال کی عمر میں قرآن پاک مکمل کرلیا تھا، منشی جمال الدین صاحب مجھے روزانہ ایک گھنٹے قرآن کا ترجمہ وتفسیر پڑھاتے تھے، مولانا محمد ایوب ایک گھنٹے فارسی کی تعلیم دیتے تھے اور دو گھنٹے روز انگریزی تعلیم حاصل کرتی تھی۔''

انھوں نے دینی علوم اور مختلف زبانوں میں مہارت کے ساتھ ساتھ فنِ سپہ گری اور فوجی ٹریننگ بھی حاصل کی تھی۔

سلطان جہاں بیگم کی مختلف خدمات اور بھوپال کی ترقی میں ان کا حصہ بہت زیادہ ہے۔ یہاں مختصراً اس کا خلاصہ پیش کرسکتی ہوں۔

کتب خانہ حمیدیہ ۱۹۱۲ء میں اپنے بیٹے کے نام سے حمیدیہ کتب خانہ قائم کیا، جو بقول علامہ سید سلیمان ندویؒ ہندوستان کے دس مشہور کتب خانوں میں سے ایک تھا، جو آزادی کے بعد تباہ ہوگیا، اس میں بڑی نفیس کتابیں تھیں، لوگ اس سے استفادہ کے لئے جگہ جگہ سے بھوپال وارد ہوتے تھے۔

بھوپال ریاست میں تمام علمی وادبی کارنامے انجام دینے کے ساتھ ساتھ ہندوستان کے ہر اہم ادارہ کی آپ نے مدد کی، دارالعلوم ندوۃ العلماء اور دارالعلوم دیوبند آپ کی فیاضیوں سے مستفید ہوتے ہی رہتے تھے۔ دارالمصنفین آپ کے مصارف سے ہی قائم ہوا، علی گڑھ یونیورسٹی سے بھی آپ کا بہت تعلق تھا۔ آپ اس کی چانسلر بھی رہیں اور نواب حمید اللہ خاں کو وہاں تعلیم کے لئے بھیجا۔ حضور ﷺ کی سیرت پر ساری دنیا کی سب سے بہتر کتاب اپنے ذاتی مصارف سے طبع کرائی جس کی تصنیف علامہ شبلی اور سید سلیمان ندویؒ کی ہے۔

عورتوں کی تعلیم میں بہت زیادہ دلچسپی لی، کئی مدرسے اور اسکول قائم کئے، یہی وجہ ہے کہ بھوپال میں عورتوں میں ابتداء سے ہی تعلیم وتعلم کا رواج ہے، آزادی کے بعد جو دینی مدرسے

لڑکوں اور لڑکیوں کے قائم ہوئے یہ سب بھی انہی کا فیضان ہے۔ حکومتی نظام، آراضی کی اصلاحات اور ٹیکس وصولی کے قواعد میں زبردست ترقی و اصلاحات کیں لیکن اس وقت یہ ہمارا موضوع نہیں ہے۔

تصنیفات: اپنی بے پناہ مصروفیات کے باوجود آپ لکھنے پڑھنے کا وقت بھی نکال لیتی تھیں، آپ نہایت درجہ مثقف تھیں، آپ کی کئی تصنیفات ہیں چند کتابوں کے نام حسب ذیل ہیں ہدیات الزوجین، سبیل الجنان، روضۃ الریاحین، تزک سلطانی، گوہر اقبال، حیات شاہ جہانی، اختر اقبال، تذکرہ باقی، حیات قدسی، باغ عجیب وغیرہ۔ سلطان بیگم بہت ماہر خطیبہ بھی تھیں، ان کا خطاب بڑا موثر اور دلنشیں ہوتا تھا۔

تعمیرات: سلطان بیگم کو شاہجہاں بیگم کی طرح عمارتیں بنانے کا بھی شوق تھا، انھوں نے اپنے بیٹے نواب حمید اللہ خاں کے لئے ایک محلہ احمد آباد کے نام سے بسایا تھا، جہاں بڑی بڑی عمارتیں، حکومتی مراکز اور باغات تھے، اس علاقہ میں ترکش اسٹائل میں ایک منارہ کی خوبصورت مسجد صوفیہ مسجد کے نام سے بنائی تھی، جو استنبول میں واقع مسجد ابا صوفیہ کے طرز پر ہے۔

سفرِ حج: شاہ جہاں بیگم نے بڑے بڑے کارنامے انجام دیئے لیکن وہ حج نہ کرسکیں، ان کا حج بدل تاج المساجد کے معمار ثانی مولانا عمران خان ازہری نے تاج المساجد کی تکمیل کے سفر کے دوران کیا۔ لیکن سلطان جہاں بیگم نے ۱۳۲۱ھ میں حج کا فریضہ ادا کیا، ان کے ساتھ ایک بڑی تعداد رشتہ داروں، احباب اور اعیان سلطنت کی تھی، پہلے براہ ینبع مدینہ تشریف لے گئیں، اور دو ماہ وہاں قیام کیا، پھر حج کی ادائیگی کے لئے مکہ مکرمہ تشریف لائیں اور ۸ر محرم ۱۳۲۱ھ کو واپس بمبئی پہنچیں، آپ نے اپنے سفرِ حج کی بہت دلچسپ روداد لکھی ہے، جس سے ایکسو دس سال پہلے کے حج کا نقشہ سامنے آجاتا ہے۔

سلطان جہاں بیگم بہت دیندار اور متقی حکمراں تھیں، شریعت کی حدود کی پابند تھیں ہمیشہ

کثرت سے دعاء کرنے والی، تمام بدعتوں خرافات اور ناپسندیدہ اعمال سے دور، فرائض و اجبات اور سنتوں کی ادائیگی میں برق رفتار، عید کی نماز عیدگاہ کے عورتوں والے حصے میں اسی طرح جمعہ کی نماز مخصوص حصہ میں باجماعت ادا کرتی تھیں۔ خدا نے آپ کو نظم وانتظام کی مخصوص صلاحیت بخشی تھی جس کی وجہ سے ریاست کے حالات بہت قابو میں آگئے اور لوگ اطمینان وسکون کی زندگی گزارنے لگے۔

سلطان جہاں بیگم کا ایک آخری کارنامہ یہ بھی ہے کہ انھوں نے ولی عہد کے سلسلہ میں اختلافات کے پیش نظر برطانوی حکومت سے اپنے بیٹے نواب حمید اللہ خاں کو ان کا حق دلوایا اور اپنی زندگی میں ہی اپنی گدی اپنے بیٹے کے سپرد کردی، یہ عمل اس شہنشاہی دور میں تقریباً ناممکن تھا جس کو بیگم صاحبہ نے ممکن کر دکھایا، نواب حمید اللہ خاں بھوپال کے آخری نواب ہوئے اور پھر اس عظیم ریاست وسلطنت کا خاتمہ یکم جون ۱۹۴۹ء کو ہو گیا۔

کتابیات:

۱۔ Abida Sultan Memories of Rebal Prncess. (XIV)

۲۔ بیگمات بھوپال۔ محمد امین مارہروی ۱۹۱۸ء مطبع سلطانی ریاست بھوپال۔

۳۔ نزہۃ الخواطر: ج ۷، ۱۲۳

۴۔ نزہۃ الخواطر، عبدالحی الحسنی: ج ۸، ص: ۱۸۹-۱۹۰

۵۔ کتابچہ۔ دارالعلوم تاج المساجد بھوپال، ڈاکٹر محمد حسان خان

۶۔ نزہۃ الخواطر، عبدالحی الحسنی، ج ۸۔ ص ۱۹۳

۷۔ مفتاح کنوز السنۃ، شیخ عبدالعزیز الخولی، ص ۱۶۹

۸۔ کتابچہ۔ دارالعلوم تاج المساجد بھوپال۔ ڈاکٹر محمد حسان خاں، ص ۵

۱۰۔ نزہۃ الخواطر: ج ۸، ص ۱۱۳۔

☆☆☆

محمد متین ندوی

سرونج کی دینی، علمی، ادبی خدمات-ایک جائزہ

سرونج ایک قدیم بستی ہونے کے ساتھ ساتھ دینی، علمی اور ادبی لحاظ سے بھی بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ جہاں تک سرونج کی قدامت کا تعلق ہے، تو اس کا اندازہ اس واقعے سے لگایا جاسکتا ہے کہ شق القمر کے معجزہ کو دیکھ کر راجہ بھوج نے جو چار نمائندے حضورﷺ کی خدمت میں بھیجے تھے وہ چاروں حضرات (جنھیں صحابی رسولﷺ ہونے کا شرف حاصل ہوا) جب واپسی میں سرونج پہونچے تو انھیں راجہ کی بیماری کی خبر ملی، بقول علامہ قاضی وجدی الحسینیؒ:

> ''وہ وکیل جب ہندوستان پہنچے اور سرونج ملک مالوہ میں داخل ہوئے تو راجہ کی بیماری کی خبر ملی، جلد از جلد راجہ کے یہاں پہنچے، وہ راجہ بھوجپور میں تھا۔'' (ہندوستان اسلام کے سائے میں: ص، ۲۴۹)

سرونج کی قدامت کا اندازہ اس سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ آج بھی سرونج میں ایک ایسی پختہ قبر موجود ہے، جس کے کتبہ پر ۱۹۹ھ لکھا ہوا ہے، اس کتبہ سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ اس زمانہ میں یہاں مسلمان موجود تھے۔ سرونج ایک قدیم بستی تو ہے ہی لیکن ساتھ ہی ساتھ اسے اہل علم کی بستی بھی کہا جاتا ہے، اس کہاوت میں صداقت بھی ہے،

کیونکہ عہد اکبری میں عبدالرحیم خان خاناں نے سرونج میں ایک لائبریری قائم کی تھی، جس کا ذکر محمد شفیع برہان پوری نے اپنے تحقیقی مقالے میں کیا ہے، دوسری بات یہ کہ مغلیہ دور حکومت ۱۱۲۹ھ کے ایک شاہی فرمان کے حوالے سے ''آثار مالوہ'' کے مصنف مشہور ادیب اور مؤرخ و محقق سید مرتضیٰ نظر صاحب لکھتے ہیں:

''اس شاہی فہرست سے سرونج میں چھوٹی بڑی ۱۵، جامع مساجد اور ۴۸ رغیر جامع مسجد، جملہ ۶۳ رمسجدوں کا وجود ثابت ہے اور یہ وہ مساجد ہیں، جن میں امام خطیب، مؤذن، جاروب کش، مامور تھے اور جن کو یومیہ خزانہ سرونج سے وظیفے ملا کرتے تھے۔'' (آثار مالوہ: ص، ۱۲۵، ۱۲۶)

اس موقع پر سید احمد شہیدؒ کے تعلق سے مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی صاحبؒ کی کتاب ''سیرت سید احمد شہید: ج، اول'' سے بھی چند سطریں پیش کی جارہی ہیں، جو سرونج کی تہذیب وثقافت اور دینی رجحانات کو سمجھنے کے لئے معاون ثابت ہوں گی:

''رائے بریلی سے ۱۲۲۶ھ میں آپ دہلی تشریف لے گئے، یہ دہلی کا دوسرا سفر تھا، کچھ مدت دہلی میں قیام فرما کر آپ ۱۲۲۷ھ میں نواب میر خاں کے لشکر میں تشریف لے گئے، جو وسط ہند کے بعض راجاؤں سے برسر پیکار تھے۔''

یہ اس زمانہ کی بات ہے، جب سرونج نواب میر خاں کی عمل داری میں آچکا تھا لیکن ابھی ان کا انگریزوں سے معاہدہ نہیں ہوا تھا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ سید صاحب کا ہی فیض ہے جو سرونج بدعت وخرافات سے محفوظ ہے۔ سید صاحب کی شہادت کے بعد ان کے کئی معتمد یہاں پر مختلف عہدوں پر فائز رہے، اور یہ بات ناممکن ہے کہ سید صاحبؒ

کے تربیت یافتہ کسی بستی میں رہیں اور وہاں دین کا کام نہ کریں۔ سید مرتضیٰ نظر صاحب سید احمد شہیدؒ کے ایک خلیفہ اور معتمد مولوی خیر الدین صاحبؒ کا یوں تذکرہ کرتے ہیں:

''مولوی خیر الدین مرحوم۔ قصبہ شیر کوٹ ضلع بجنور، یو. پی. کے رہنے والے متبحر عالم، مقرر، شجاع اور حضرت امیر المومنین مولانا سید احمد شہید بریلویؒ کے خلفاء اور معتمدین جنرلوں میں سے تھے،.....آپ ہی کی شجاعت، وتدبر کا نتیجہ تھا کہ اس وقت سرونج عادل خاں اور تانتیا ٹوپ کے حملوں سے محفوظ رہا۔ حضرت سید صاحب کے جہادی مشغلہ کے سلسلہ میں آپ نے نمایاں خدمات انجام دی ہیں ۱۲۶۴ھ میں سرونج کی نظامت پر مامور ہوئے۔''

سرونج میں علماء گذرے ہیں، ان میں مولانا محمود الحسن صاحب قاسمی، قاری فصیح احمد قاسمی اور مفتی عبد المجید صاحب قاضی شہر سرونج کے نام بڑی اہمیت کے حامل ہیں، اول الذکر دونوں علمائے کرام صوبہ بہار سے تعلق رکھتے تھے، ۲۵/مارچ ۱۹۲۹ء کو جب مدرسہ ریاض المدارس سرونج کا قیام عمل میں آیا، تو اس کے سب سے پہلے استاد مولانا محمود الحسن صاحب اور دوسرے قاری فصیح احمد صاحب قاسمی جو چار ماہ بعد تشریف لائے تھے اور ۱۹/سال تک پوری مستعدی کے ساتھ تدریسی واصلاحی فرائض بحسن وخوبی انجام دیتے رہے، مولانا محمود الحسن صاحبؒ قاری صاحب سے پہلے وطن واپس چلے گئے تھے، مذکورہ دونوں حضرات کی تعلیمی واصلاحی اور ادبی خدمات سے انکار نہیں کیا جا سکتا، اس وقت مجھے غالبؔ کا ایک مصرع یاد آرہا ہے اور اسی کی روشنی میں ہم وہ بات کہہ رہے ہیں جو کہ شعر کے بعد موجود ہے۔

ہم سخن فہم ہیں، غالبؔ کے طرفدار نہیں

قاری صاحب نہ تو سرونج کے تھے اور نہ انھوں نے یہاں پر مستقل سکونت اختیار کی اس کے باوجود جہاں تک میں سمجھتا ہوں سرونج کے دیگر علمائے کرام کے مقابلہ میں ان کی دینی وعلمی خدمات کو فوقیت حاصل ہے، کیونکہ وہ صرف ولی صفت ہی نہیں تھے بلکہ انھوں نے تدریسی خدمات کے ساتھ ساتھ عوام الناس کی اصلاح کا کام بھی بڑی لگن سے انجام دیا، سرونج کے موجودہ سینئر علمائے کرام (مولانا نذیر الدین صاحب قاسمی، مولانا زبیر احمد صاحب راہی قاسمی، قاری ہادی حسن صاحب قاسمی، مولانا احمد سعید صاحب قاسمی، مفتی سلیمان صاحب مظاہری،) انھیں دونوں کے شاگرد ہیں۔ان کے ایک بہت ہی مایۂ ناز شاگرد اور مدرسہ ریاض المدارس کے قابل فخر طالب علم تھے مولانا مظہر بقا قاسمی، جو تقسیم ہند کے موقع پر پاکستان ہجرت کر گئے تھے، انھوں نے ہندوستان میں سعادت ہائی اسکول سرونج، پاکستان میں سندھ یونیورسٹی، کراچی یونیورسٹی، قائداعظم یونیورسٹی اسلام آباد کے علاوہ جامعہ ام القریٰ مکہ مکرمہ میں علمی وتدریسی خدمات انجام دیں اور بہت سی کتابیں بھی تصنیف وتالیف کیں۔ان کی چند کتابوں کے نام یہ ہیں۔ ابوالعلاء معری، اصول فقہ اور شاہ ولی اللہ، المختصر فی اصول الفقہ، حیات بقا، یادیں اور چند یادگار سفر وغیرہ۔مشہور افسانہ نگار ظفر اوگانوی نے بھی مدرسہ ریاض المدارس سرونج میں ہی ابتدائی تعلیم حاصل کی اور ان کا بچپن یہیں کے علمی وادبی ماحول میں گذرا تھا، کیونکہ ان کے والد صاحب اس وقت یہیں مدرسہ میں دینی خدمات انجام دے رہے تھے۔

تیسری شخصیت ہے مفتی عبدالمجید صاحب کی، مفتی صاحبؒ ایک جید عالم دین ہی نہیں بلکہ پیر طریقت بھی تھے، ان کی مجالس بڑی اہمیت اور افادیت کی حامل ہوا کرتی تھیں، جن میں سرونج و دیگر مقامات کے اہل علم و ادب شریک ہوا کرتے تھے، کچھ غیر مسلم حضرات بھی ان کی مجالس میں پابندی کے ساتھ شریک ہوتے تھے۔

دینی وعلمی لحاظ سے ایک مختصر جائزہ پیش کردیا گیا اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ادبی لحاظ سے بھی سرونج پر ایک نظر ڈالی جائے۔ علمی ودینی لحاظ سے ہی نہیں بلکہ ادبی لحاظ سے بھی سرونج کافی خوش نصیب رہا ہے، کیونکہ یہاں پر اس وقت بھی مرمت خاں مرمت جیسا ایک قادر الکلام شاعر موجود تھا، جب دہلی میں میر تقی میر کا ڈنکا بج رہا تھا، بطور نمونہ مرمت خاں مرمت کے دو شعر پیش خدمت ہیں۔

سکندر اور دارا کی تھی اڑتی خاک قبروں پر　　جو دیکھا حال میں نے جا کے کل گور غریباں کا
خط کا کیا ذکر ہے واں تو مرمت ہرگز　　پوچھ سکتا نہیں پیغام زبانی ۔ افسوس

بعد کے دور میں ناطق مالوی، دانش مالوی، وقار فاطمی، دلکش ساگری، اچھن میاں راز، میر عرفانی اور ضیاء اسدی کے نام نمائندہ شعراء کی فہرست میں رکھے جاسکتے ہیں۔ مذکورہ شعراء کے بطور نمونہ دو دو شعر پیش کئے جارہے ہیں۔

مسکراتے ہوئے وہ جام بڑھانا ان کا　　کوئی انکار کا پہلو ہی نہ تھا کیا کرتا
زندگی اپنے مقاصد میں ہے ناکام ابھی　　کہہ دو ساقی سے کہ گردش میں رہے جام ابھی

ناطق مالوی

آؤ میرے شہر کے لوگو، آؤ مجھے دیوانہ کہو　　انسانوں کو ڈھونڈ رہا ہوں انسانوں کی بستی میں
اب تو اس حقیقت پر خود یقیں نہیں آتا　　تم سے دور رہ کر بھی ہم نے دن گزارے ہیں

دانش مالوی

مانتے کب ہیں جانتے سب ہیں　　ہم جو بدلیں تو یہ جہاں بدلے
لوگ سب اسکے لٹنے سے پریشاں کیوں ہیں　　شاخ امید سے پتا نہیں جانے والا

وقار فاطمی

نہ میں رسول نہ ہادی نہ پیشوا نہ امام　　مجھے تو میرے وطن سے نکالتا کیوں ہے

تجھے تلاش ہے جس کی وہ تیری ذات میں ہے
یہ کوہ دیں یہ سمندر کھنگالتا کیوں ہے
دلکش ساگری

دل گیا دل کے سب ارمان گئے
زندگی لے ترے سب مہمان گئے
کچھ سرد سرد آہیں، کچھ گرم گرم آنسو
یہ زندگی ہے میری پروردگار میرے
اچھن میاں راز

اے شب غم کچھ خبر ہے آج وہ آنے کو ہیں
عمر بھر کا آج تجھ سے ساتھ چھوٹا جائے ہے
میر اب ان کو کون سمجھائے
وہ تو آئے تھے ہم کو سمجھانے
میر عرفان

پرواز کی ضد چھوڑ دو شاہین سے مت الجھو
جان اپنی گنوا دو گے دو چار اڑانوں میں
مری روداد سننے کے لئے دل کس کا لاؤ گے
مجھی سے اپنے افسانے کو دوہرایا نہیں جاتا
ضیاء اسدی

عصر حاضر کے نمائندہ شعراء میں مولانا زبیر احمد راہی قاسمی (یہ عربی، فارسی اور اردو زبان کے ماہر اور فن عروض پر دسترس رکھنے والے استاد شاعر ہیں، سیفی سرونجی کے علاوہ بقیہ نمائندہ شعراء بھی انھیں کے شاگرد ہیں) ڈاکٹر شان احمد فخری، پروفیسر خالد محمود، پروفیسر مختار شمیم، ڈاکٹر سیفی سرونجی اور ڈاکٹر شاہد میر کے نام لئے جاسکتے ہیں، نمائندہ شعراء کے دو دو شعر پیش ہیں ؎

حال کو عہد گذشتہ سے بھلا کیا نسبت
جتنا تاریک ہے دن رات کہاں تھی پہلے
امیر کاروان رہزن ہے لیکن
کسی راہی کو حیرانی نہیں ہے
زبیر احمد راہی قاسمی

غرور ذات نہ احساس کمتری مجھ کو
میں زندگی کو سمجھتا ہوں، زندگی مجھ کو

یلغار ختم ہوگی اندھیروں کی ایک دن
فخریؔ نئی سحر کے پیمبر بھی آئیں گے
شان احمد فخریؔ

میں تجھ سے بڑھ کے سیاسی شعور رکھتا ہوں
مری گلی میں یہ کچے مکان رہنے دے

میں اس مزار میں ہر شام دفن ہوتا ہوں
زمانے بھر کو جو بستر دکھائی دیتا ہے
خالد محمود

کسے پڑی ہے جو دریا کے پار اترے گا
تہوں میں ڈوب بھی جاؤں تو کون دیکھے گا

کبھی لشکر غموں کا ہے، کبھی فتنے تمنا کے
عجب کہرام برپا ہے، دلِ کی راجدھانی میں
مختار شمیم

سر پر نہ آپڑے کہیں چلتے ہیں بیچ کے لوگ
سیفیؔ ترے مکان کی دیوار دیکھ کر

بھٹک نہ جائے مسافر کوئی اندھیروں میں
قریب گاؤں کے روشن الاؤ رہنے دے
سیفی سرونجی

آسمانوں پر دیئے جلنے لگے بارود کے
آج پھر شاہدؔ دیارِ کربلا روشن ہوا

اور کچھ بھی مجھے درکار نہیں ہے لیکن
میری چادر میرے پیروں کے برابر کردے
شاہد میر

ان کے علاوہ بھی سرونج میں قابلِ ذکر شعراء موجود ہیں جیسے طالب عرفانی، مقبول عالم اظہریؔ، غازی ولی احمد ولیؔ چشتی، ڈاکٹر نفیس تقی، شفیق سرونجی، محی الدین انجم، ظفر سرونجی، سلیمان آزر، آصف سرونجی، قدیر صحرا وغیرہ۔

جہاں ایک طرف سرونج میں شعراء کی کثرت رہی ہے وہیں دوسری طرف نثر کے میدان میں قحط سا رہا ہے اور یہ بات طے ہے کہ جس شہر میں نثر نگاروں کی کمی رہتی ہے، وہاں کے اچھے شعراء بھی عموماً گوشۂ گمنامی کی نذر ہو جاتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ سرونج کے

اچھے اچھے شعراء بھی ادبی دنیا میں وہ شہرت و مقبولیت نہ حاصل کر سکے جسے کے وہ بجا طور پر مستحق تھے، جب ہم سرونج کی گذشتہ تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں، تو سب سے اہم نام سید مرتضیٰ نظر وکیل کا نظر آتا ہے، ان کی کتاب ''آثار مالوہ'' تاریخی اور تحقیقی اعتبار سے اپنے موضوع پر منفرد ہے، اصطلاحی معنوں میں ''آثار مالوہ'' ادبی کتاب نہ سہی، لیکن حقیقی معنوں میں اسے ادب سے خارج بھی نہیں کیا جا سکتا۔ سید مرتضیٰ نظر قابل فخر محقق، مؤرخ اور نثر نگار ہی نہیں بلکہ بہت اچھے شاعر بھی تھے، انہیں کے زمانہ کی ایک قلمی کتاب ''آئینۂ حقیقت'' بھی میری نظروں سے گذری ہے اس کے مصنف ڈاکٹر عزیز الدین ندوی مہتمم مدرسہ ریاض المدارس سرونج دادا بشیر الدین صاحب پیروکار تھے، اس کتاب میں اس وقت کے سرونج کے مسلم معاشرے کی تصویریں دیکھی جا سکتی ہیں، حالانکہ مدرسہ ریاض المدارس ہی اس کتاب کا محور اصلی ہے، پیروکار صاحب مدرسہ ریاض المدارس کے بانی ہونے کے ساتھ ساتھ پہلے مہتمم بھی تھے اور مدرسہ کی فکر ان کی تمام فکروں پر غالب بھی تھی، پیروکار صاحب میں جو دینی فکر و تڑپ تھی وہ مجددی خاندان سے نسبت کے نتیجہ میں وجود میں آئی تھی۔ اسی دور میں ایک علمی شخصیت حکیم فخر احمد صاحب کی بھی تھی، حکیم صاحب بہت اچھے حکیم ہونے کے ساتھ ساتھ عربی، فارسی اور اردو زبان پر مہارت بھی رکھتے تھے، لیکن اسے سرونج کی بدقسمتی ہی کہیں گے کہ ان کی کوئی کتاب زیور طبع سے آراستہ نہ ہو سکی۔

سرونج کے منتخب شعراء کے کلام پر مشتمل مجموعہ ''گمنام گوشے'' کے نام سے آزادی کے بعد شائع ہوا، اس کی اہمیت اس لئے بھی زیادہ ہے کہ آزادی کے بعد ۱۹۷۲ء میں شائع ہونے والی یہ پہلی کتاب ہے، صحیح معنوں میں جدید شاعری کی بنیاد رکھنے والے دلکش ساگری ہی تھے۔ کیونکہ ان سے پہلے اہل سرونج جدیدیت سے مانوس نہیں تھے، سرونج کے ادب پر ڈاکٹر شان احمد فخری کی کتاب ''سرونج کی ادبی خدمات'' بھی بڑی اہمیت کی

حامل ہے، اگر چہ اس کتاب میں کچھ خامیاں بھی ہیں۔لیکن اتنے بڑے پروجیکٹ میں دوستی وتعلقات کی بنیاد پر کچھ خامیوں کا در آنا کوئی تعجب کی بات نہیں۔ڈاکٹر شان احمد فخری صاحب ایک اچھے نثر نگار ہی نہیں بلکہ بہت اچھے شاعر بھی ہیں، لیکن پتہ نہیں کیوں چھپنے چھپانے کی طرف انہوں نے توجہ نہیں دی، شاید یہ بات انھیں اپنے والد حکیم فخر احمد صاحب سے وراثت میں ملی ہے۔

عصر حاضر کے نمائندہ نثر نگاروں میں پروفیسر خالد محمود، پروفیسر مختار شمیم، ڈاکٹر سیفی سرونجی، ڈاکٹر شاہد میر اور ڈاکٹر شان احمد فخری کے نام لئے جاسکتے ہیں، ان حضرات نے سرونج کو ادبی دنیا میں متعارف کرانے میں اہم رول ادا کیا ہے، بالخصوص ڈاکٹر سیفی سرونجی کا نام سرونج کو متعارف کرانے والوں میں سرفہرست ہے، کیونکہ سیفی سرونجی شعری اور نثری میدان میں نمائندگی کے فرائض بحسن وخوبی انجام دیتے ہوئے سہ ماہی ''انتساب'' جیسا انٹرنیشنل ادبی رسالہ بھی ۲۶ رسالوں سے پابندی کے ساتھ نکال رہے رہیں۔اس موقع پر سرونج کی ہر دلعزیز شخصیت انل اگروال کا ذکر بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کیونکہ سہ ماہی ''انتساب'' کے سرپرست تو ہیں ہی ساتھ ہی فقط ادب نواز ہی نہیں بلکہ ادیب نواز بھی ہے۔

مجموعی اعتبار سے یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ دور حاضر میں سرونج کی ادبی رفتار کافی حد تک تسلی بخش ہے، کئی لکھنے والے سنجیدگی کے ساتھ اپنے کام میں معروف ہیں، منجملہ یہ راقم سطور بھی اپنی استطاعت بھر اس میدان مین سرگرم عمل ہے۔

☆☆☆

پروفیسر محمد حسان خان

مولانا محمد عمران خاں ندوی، ازہری کی علمی، دعوتی، ملی اور اصلاحی خدمات

ہندوستان کی آزادی کے بعد جبکہ ہندوستان کے مسلمان ذہنی اور فکری لحاظ سے افراتفری کے شکار تھے جبکہ نفسانفسی کا عالم تھا تو چند لوگ جنہوں نے مسلمانوں کی ذہنی و فکری تعمیر و تشکیل میں بھرپور حصہ لیا، اور مادی منفعتوں اور ذاتی مفاد سے بلند ہو کر مسلمانوں کی دینی و فکری سربلندی کے لئے بے لوث خدمت کی اور زندگی بھر اسی مقصد کی تکمیل میں سرگرم عمل رہے اور آنے والی نسلوں کے لئے ایک پائیدار عمارت تیار کرنے میں کامیابی حاصل کرلی۔ وہ بزرگ جو خلوص و ایثار، ہمت و عمل کا پیکر ہوتے ہیں ان کے کارنامے اور ان کی حیات درخشاں تاروں کی طرح ہمیشہ آب و تاب کے ساتھ چمکتی رہتی ہے اور زندگی کی اندھیری راتوں میں راستے کے متلاشیوں کی رہبری کا کام کرتی ہے اور انہی کے کارنامے قومی اصلاح اور سربلندی کا کام دیتے ہیں، یہی وہ بزرگ ہوتے ہیں جنکی حیات نوجوانوں کے لئے شمع ہدایت بنتی ہے۔ مولانا عمران خاں ندوی، ازہری

مرحوم بھی انہی بزرگوں میں سے ہیں جن کی زندگی عزم وعمل اور ہمت وقربانی کی اعلیٰ مثال تھی۔

مولانا بقول مولانا پروفیسر مسعود الرحمٰن صاحب ندوی، ازہری:

''اس دور قحط الرجال میں ایک مثالی پیکر تھے علم کے، حق وصداقت کے، محبت وخلوص کے اور سب سے بڑھ کر تقویٰ وطہارت اور خشیت الٰہی کے۔'' (حیات عمران صفحہ ۱۲)

مولانا عمران خاں ایک سوانحی خاکہ:

یہاں بہت اختصار سے مولانا کی حیات کا خلاصہ پیش خدمت ہے۔

مولانا نسلاً افغانی پٹھان تھے، ان کے خاندان کے بزرگ سرحد سے دہلی منتقل ہوئے، اس کے بعد انقلاب ۱۸۵۷ء میں آپ کے پردادا نور محمد صاحب پہلے ریاست بھیکم پور اور اس کے بعد شاہجہاں بیگم کے عہد میں بھوپال دارالاقبال منتقل ہوئے، ان کے دونوں معصوم بیٹوں مفتی عبدالہادی خان اور حافظ محمود صاحب کے حافظ اور قاری ہونے کی وجہ سے بڑا استقبال کیا گیا۔ اور قدر ومنزلت کا معاملہ کیا گیا۔ خاندان کا قیام تاج محل میں رہا۔ کیونکہ اس زمانے میں بھوپال میں حفظ کا رواج نہ تھا۔

نواب سلطان جہاں بیگم کے زمانے میں حافظ محمود خان صاحب کو مہتمم مساجد وظائف مقرر کیا گیا۔ وہ اپنی حق پرستی اور حق گوئی میں مشہور تھے، کسی بات پر نواب سلطان جہاں سے ناراض ہو کر مکہ معظمہ چلے گئے، سلطان جہاں جب حج کو گئیں تو ان کو راضی کر کے بھوپال واپس لائیں۔

نور محمد خان کے دوسرے بیٹے قاری عبدالہادی خان صاحب ۲۶/اگست ۱۹۱۹ء میں

مفتی ریاست مقرر ہوئے، یہ مولانا مرحوم کے دادا تھے، وہ بڑے جلیل القدر عالم اور قرأت وتجوید میں ماہر تھے، قاری عبدالرحمٰن پانی پتی سے ان کا مباحثہ مشہور ہے جس کے بعد قاری صاحب نے ان کو اپنی سند عطا کی، انھوں نے قرأت کی مشہور کتاب "شاطبیہ" کا ترجمہ "ھدایۃ القراء" کے نام سے کیا ہے۔ حج کے ارادہ سے حجاز تشریف لے گئے اور ۱۰ر مئی ۱۹۲۹ء کو وہیں انتقال ہوا اور حضرت خدیجہؓ کے پائینتی جنت المعلیٰ میں دفن ہوئے۔

مولانا کے والد حافظ محمد الیاس خان صاحب بڑے عالم اور زبردست منتظم ومدبر تھے، اپنے چچا حافظ محمود صاحب کے انتقال کے بعد مساجد وظائف ومناصب کے مہتمم ہوئے، بعد میں اوقاف اسلام کا چارج بھی ان کو دے دیا گیا، انھوں نے اپنی حسن تدبیر اور غیر معمولی صلاحیتوں کو کام میں لاکر ان محکموں میں زبردست اصلاحات کیں۔ مولانا مرحوم اس وقت ندوۃ العلماء میں مہتمم ہو چکے تھے، اسہال کی بیماری کے علاج کے لئے ان کو لکھنؤ لے گئے، وہیں ان کا انتقال ہوا اور ڈالی گنج کے قبرستان میں دفن ہوئے۔

مولانا محمد عمران خان ۱۳ر اگست ۱۹۱۳ء کو پیدا ہوئے، بچپن میں قرآن پاک حفظ کیا اور ۹ سال کی عمر میں مسجد شکور خاں میں تراویح سنائی، جہانگیریہ اسکول میں تعلیم پائی، پھر مفتی عبدالہادی صاحب کے اصرار پر مولانا اور ان کے چھوٹے بھائی مولانا محمد عرفان خاں کو دارالعلوم ندوۃ العلماء تعلیم حاصل کرنے کے لئے بھیج دیا گیا۔

مولانا عمران خاں نے ندوہ جانے کا سبب بتاتے ہوئے کہا میرے ندوہ جانے کا سبب بھی دادا میاں مرحوم ہی تھے" فرمایا کہ میں اور میرے چھوٹے بھائی محمد عرفان خان ہم دونوں بھوپال کے جہانگیریہ اسکول میں پڑھتے تھے جب میں آٹھویں اور عرفان میاں ساتویں کلاس میں پاس ہوئے تو والد صاحب میرے اور عرفان میاں کے پاس ہونے کی

خوش خبری مفتی عبدالہادی صاحب کو دینے گئے، یہ خبر سن کر انہوں نے دھیمی آواز میں بجائے مسرت وخوشی کے اپنی بے التفاتی کا اظہار اس طرح فرمایا دیا: "انگریزی مدرسہ میں پاس ہونے سے ہمیں کیا خوشی، اگر ان کو عربی پڑھاتے تو خوشی کی بات تھی" یہ بات والد صاحب کے دل کو لگ گئی، والد صاحب نے غور وخوض اور مشورے کے بعد ہم لوگوں کے داخلہ کے لئے ندوۃ العلماء کا انتخاب کیا" مولانا عمران خاں نے آگے فرمایا کہ "آج دادا میاں مرحوم ہی کا فیض ہے کہ پورا خاندان، میری اور بھائیوں کی تقریباً تمام اولادیں، سب نے ندوۃ العلماء ہی میں تعلیم حاصل کی اور سب الحمدللہ دین کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں" اس تاریخ سے آج تک شاید ہی کوئی ایسا وقت آیا ہو کہ جب ہمارے خاندان کہ کچھ لڑکے دارالعلوم ندوۃ العلماء میں تعلیم حاصل نہ کررہے ہوں۔

مولانا محمد عمران خان صاحب نے مزید فرمایا:

> "دارالعلوم تاج المساجد بھوپال میں بھی ہم نے دارالعلوم ندوۃ العلماء کے طرز پر تعلیم کا آغاز کیا یہاں سے طلباء "عالم" تک تعلیم حاصل کر کے دارالعلوم ندوۃ العلماء دوسال کے لئے فضیلت کی ڈگری لینے جاتے ہیں۔ یہ سب دادا میاں مرحوم کا فیض اور ان کی دعاؤں کا ثمرہ ہے۔"

(حیات عمران صفحہ:۱۹و۲۰)

مولانا یکم جون ۱۹۲۶ء کو درجہ دوم میں داخل ہوئے "الہاتف" اور "المنقلب" قلمی رسالوں کی ادارت سنبھالی اور ۱۹۳۳ء میں فضیلت پاس کیا، ابتدا ہی سے آپ کی علمی و انتظامی قابلیت نظروں میں آنے لگی تھی، تمام لوگوں نے آپ کی انتظامی صلاحیتوں کا اعتراف کرلیا تھا، فراغت کے فوراً بعد آپ کو ۶ رنومبر ۱۹۳۳ء میں ندوہ کا منصرم بنایا گیا، اس وقت مولانا کی عمر صرف ۲۰ سال تھی۔

پھر ۱۶/اکتوبر ۱۹۳۷ء کو جامعہ ازہر مصر پہنچے اور ۱۰/دسمبر ۱۹۳۹ء کو واپس لوٹے، آپ نے تخصص کی ڈگری فرسٹ ڈویژن اور فرسٹ پوزیشن میں حاصل کی، ایک ہندوستانی نے یہ پوزیشن حاصل کی اس لئے حیرت کی بات تھی، مصر کے تمام اخباروں نے اس خبر کو چھاپا اور ہندوستان کے اخبارات نے بھی اس خبر کو اہتمام کے ساتھ شائع کیا۔ سید سلیمان ندوی نے معارف میں شذرات تحریر فرمائے اور واپسی پر ندوہ، دہلی اور بھوپال میں استقبالیہ تقاریب منعقد ہوئیں۔ واپسی کے بعد بھوپال میں کلکٹر بنانے کی کوششوں کے بیچ سید صاحب اور مولانا مسعود علی صاحب نے دادا میاں کو خط لکھ کر اصرار کیا کہ اپنے ایک بچے کو ندوہ پر قربان کردیں، اصرار کے بعد دادا میاں نے اجازت دیدی۔

سید صاحب نے ۲۷/جنوری ۱۹۴۰ء کو نائب مہتمم مقرر کیا، یکم فروری ۱۹۴۱ء کو قائم مقام مہتمم اور ۲۶/اپریل ۱۹۴۲ء کو مہتمم مقرر ہوئے اور ۱۹۵۸ء تک اس عہدہ جلیلہ پر فائز رہے۔

بھوپال کا قیام اور اس کی ضرورت:

ملک کی تقسیم کے بعد حالات نے کروٹ لی اور خاص طور پر ان ریاستوں کے لئے بڑے بڑے مسائل پیدا ہوئے جہاں نوابی تھی اور بالخصوص بھوپال ریاست کے لئے جہاں سارے دینی، علمی اور اسلامی بلکہ غیر مذاہب کے کام بھی ریاست کے بجٹ سے ہوتے تھے، پورا برٹش انڈیا اپنے کاموں کو چندوں سے چلاتا تھا، لیکن جب بھوپال کے لوگوں سے چندہ مانگا جاتا تھا تو وہ نہایت بھولے پن سے کہتے کہ کیا وہاں کوئی نواب نہیں۔ مولانا نے چندہ دینے کا ذہن بھی بنایا اور بڑے بڑے چندے وصول کر کے بڑے بڑے کام کئے۔

دارالعلوم تاج المساجد بھوپال:

مقامی تبلیغی کام جماعت ہدایت المسلمین کے بینر کے تحت شروع کیا گیا تھا، ندوہ

سے لوٹنے کے بعد مولانا ہی اس جماعت کے امیر تھے، ان کی پوری زندگی تعلیم وتعلم میں گزری، جو علوم دینیہ کو فرض عین جانتے تھے اور اس کو رواج دینے کی کوشش کرتے تھے، ان کے پیش نظر ایک تربیت گاہ بھی تھی، جس میں علوم دینیہ کے ساتھ دعوتی کام کی مشق کرانا بھی مقصود تھا، اس سلسلہ میں مشورے جاری تھے اور پروگرام تیار کئے جارہے تھے کہ اچانک کمشنری سرکار نے یکم جون ۱۹۴۹ء کو ریاست کے خاتمہ کا اعلان کردیا، مارچ ۱۹۵۰ء میں اعلان کیا گیا کہ جامعہ احمدیہ میں اب دینی تعلیم کا سلسلہ ختم کیا جارہا ہے، اب وہ صرف ایک اسکول کی طرح چلے گا جس میں سیکولر تعلیم دی جائے گی، اس اعلان کے بعد تمام لوگ بے چین ہوگئے، علامہ سید سلیمان ندوی بھوپال میں قاضی کے عہدہ پر فائز تھے، مولانا مرحوم نے ان سے عرض کیا کہ ایک دینی ادارہ بنانا چاہتے ہیں، سید صاحب نے بڑی خوشی کا اظہار کیا اور اپریل ۱۹۵۰ء میں جامع مسجد میں ایک جلسہ ہوا اور سید صاحب نے اپنی تقریر سے دار العلوم کا افتتاح فرمایا، دوسرے دن یہ مدرسہ مسجد شکور خان میں قائم ہوگیا، تین مہینے اسی طرح چلتا رہا، اس کے سب سے اہم استاد مولانا اشفاق الرحمٰن کاندھلوی تھے اور وہ اس وقت دار العلوم بھوپال کہلاتا تھا، پھر مولانا مرحوم نے امور مذہبی کے آفس سے تاج المساجد کا قبضہ حاصل کرلیا، اس میں اجتماع تو دسمبر ۱۹۴۸ء سے منعقد ہورہا تھا، اس وقت تک دو اجتماع ہوچکے تھے، قبضہ حاصل کرنے کے بعد ۲۰ر جولائی ۱۹۵۰ء کو دار العلوم بھوپال تاج المساجد میں منتقل ہوگیا اور وہاں اس کا باقاعدہ افتتاح ہوا اور اس کا نام دار العلوم تاج المساجد رکھا گیا۔ ۱۹۸۶ء میں وفات سے قبل تک مولانا اس ادارہ کو ترقی دیتے رہے یہاں تک کہ وہ ندوۃ العلماء کی سب سے اہم شاخ بن گیا۔

تعمیر تاج المساجد:

۱۹۰۱ء میں شاہ جہاں بیگم کی وفات کے بعد جو تاج المساجد کی تعمیر کا کام رکا تو پھر رکا ہی رہا۔ دار العلوم تاج المساجد کے قیام کے بعد تھوڑا بہت اصلاح کا کام ہوتا رہا، لیکن ۲۴/اپریل ۱۹۷۱ء سے تاج المساجد کی تکمیل کی مہم باقاعدہ شروع ہوئی وہ مولانا کی وفات تک بلکہ آج تک جاری ہے۔

شروع میں اس کی تکمیل کے مصارف کا اندازہ ۷۰ لاکھ تھا، بعد میں اس میں اور اضافہ ہوا جس ہمت واستقلال، جس محنت و جفاکشی اور جس عزم وحوصلہ کے ساتھ انھوں نے اس کام کو پایہ تکمیل تک پہنچایا وہ اپنی نظیر آپ ہے۔ یہ مولانا کا نہایت اختصار کے ساتھ تعارف ہے۔

مولانا کے علمی، دینی ودعوتی کارنامے

ا۔ دار العلوم تاج المساجد کی تأسیس:

جیسا کہ گزشتہ صفحات میں گزر چکا ہے مولانا سید سلیمان ندوی کے مشورے سے دار العلوم بھوپال میں مولانا عمران خان نے قائم کیا، پہلے تین ماہ مسجد شکور خان میں تعلیم جاری رہی، اس وقت اس کا نام دار العلوم بھوپال تھا، اور تاج المساجد پر مولانا کی پہلے سے نظر تھی کہ وہ مسلمانوں کے لئے ایک مضبوط اسلامی قلعہ بن سکتا ہے، اس میں دار العلوم کے قیام سے تقریباً ڈیڑھ سال پہلے، پہلا سالانہ تبلیغی اجتماع منعقد کر چکے تھے اور محکمۂ امور مذہبی سے دار العلوم کے حصول کے لئے کوشاں تھے، کیونکہ مولانا اور ان کے خاندان کا مقام ومرتبہ اور دینی خدمات اتنی زیادہ تھیں کہ تاج المساجد مولانا کی کوششوں

سے دارالعلوم کو مل گئی، ورنہ جماعت اسلامی اور دیگر کئی ادارے اس کے حصول کے لئے کوشاں تھے۔اس طرح خدائے تعالیٰ نے ایک ندوی کے ذریعہ ندوہ کے پیکر ثانی کو وجود بخشا، فکر و تخیل وہی جو ندوہ کی اساس ہے، نصاب، درس اور طریقہ تعلیم وہ جو ندوہ کا امتیاز ہے، اس کا ہر قدم ندوہ کی سمت اٹھتا ہے، ہمارا دارالعلوم تاج المساجد اسی راہ پر گامزن ہے جو راہ ندوہ نے ایک صدی پہلے بتلائی تھی، ندوہ اگر حسن ازل کی تخلیق ہے تو تاج المساجد کا یہ دارالعلوم جمال ندوہ کا آئینہ دار ہے، یہی وجہ ہے کے محبان ندوہ اس کو وسط ہند کا ندوہ کہنے میں کوئی حرج محسوس نہیں کرتے۔ جب دارالعلوم قائم ہوا اس وقت پوری ریاست اور اس کے گرد و پیش میں خوف و دہشت کی فضا طاری تھی، بانیان دارالعلوم نے خوف و دہشت کی اس فضا میں ریاست کے مسلمانوں اور ان کے واسطے سے ہندوستان کے تمام مسلمانوں میں دینی بیداری لانے کے لئے مختلف طریقے اختیار کئے، ان میں سے ایک یہ تھا جیسا کہ میں نے گزشتہ اوراق میں تحریر کیا ہے کہ بھوپال کے لوگ اسلامی کاموں کے لئے برٹش ہندوستان کے برخلاف چندہ دینے کے بالکل عادی نہ تھے، وہاں بڑے بڑے کام اور ادارے چندے سے چلتے تھے، بھوپال کے نواب و بیگمات کیونکہ ہر نیک اور اچھے کام میں پہل کر کے خرچ کرنے والے تھے اس لئے یہاں کے لوگ بالکل عادی نہ تھے، مولانا محمد عمران خاں نے یہاں کے عوام کی ایسی تربیت کی کہ وہ چندہ دینے کے نہ صرف عادی ہو گئے، بلکہ تاج المساجد کے تکمیل کے بہت بڑے منصوبہ میں دل و جان سے شریک ہوئے اور لاکھوں لاکھ چندہ دیا، عورتوں نے اپنے زیورات فروخت کر کے ان کاموں میں حصہ لیا۔

مولانا کے دارالعلوم قائم کرنے سے قدیم ریاست بھوپال بلکہ پورے مدھیہ پردیش میں مدرسوں اور دینی اداروں کا ایک سیلاب آ گیا اور دین کی طرف زبردست رجوع ہوا

اس سب کا ثواب مؤسس اول کو سب سے پہلے ملے گا۔

۲۔ تبلیغی ودعوتی جدوجہد:

مولانا عمران خاں کا تعارف تبلیغ سے دار العلوم ندوۃ العلماء میں حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ کے ذریعہ ہوا تھا، کیونکہ حضرت مولانا عرصہ ہوا اس سے منسلک ہو چکے تھے، یہ اس وقت کی بات ہے جب حضرت مولانا الیاس صاحبؒ اپنے رفقاء کے ساتھ ۱۸/جولائی ۱۹۴۳ء میں ندوہ تشریف لائے اور ۸-۱۰ دن ندوہ میں ان کا قیام رہا، مولانا محمد عمران خاں صاحب ندوہ میں اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود بعض مجلسوں میں حاضر ہوتے، عقیدت کا سلسلہ قائم ہو چکا تھا۔

ایک دن صبح کے وقت مولانا الیاس صاحبؒ مولانا کے ندوہ اہتمام آفس پہنچے، مولانا کو جب معلوم ہوا کہ حضرت مولانا الیاس صاحبؒ ملنے کے لئے تشریف لائے ہیں آپ نے جا کر ان کے شایان شان استقبال کیا، مولانا الیاس صاحبؒ نے فرمایا، مہتمم صاحب آپ کچھ وقت اس کام کو بھی دیں مولانا نے فرمایا کہ میں بہت مصروف آدمی ہوں، کئی کام میرے ذمہ ہیں اور کہا کہ آپ کا کام تو بیکار لوگوں کا کام ہے میرے بس میں کہاں، حضرت مولانا الیاس صاحب نے فرمایا بالکل غلط اگر تم ۲۰ کام کرتے ہو تو اس کو ۲۱واں کام بنالو بس ہم تو یہی چاہتے ہیں، اس گفتگو سے مولانا مطمئن ہو گئے کہ اس کام میں شامل ہونے کے لئے کوئی کام چھوڑنا ضروری نہیں، بلکہ تمام کاموں میں اس کی برکت سے اخلاص اور احسان کا جذبہ پیدا ہوگا، اس کے بعد آپ کا تبلیغ ودعوت سے تعلق بہت بڑھ گیا، بڑے حضرت جی سے بار بار ملاقات ہوتی، حضرت بھی بہت محبت فرماتے اور ان کو مولانا سے بہت توقعات تھیں۔

اس زمانہ میں آپ ندوۃ العلماء میں مہتمم تھے، وہاں نظام قائم کرنے کی وجہ سے اساتذہ کے کچھ اختلافات بھی تھے، دوسری اہم وجہ تھی ہندوستان کی آزادی کے بعد بھوپال کے اسلامی اداروں اور سیکولر حکومت کے قیام کے امکانات کی وجہ سے بھی مولانا کو بہت فکر تھی، حضرت صاحب کے مشورے کے بعد مولانا نے ندوہ سے ۱۵ر ستمبر ۱۹۴۷ء کو رخصت لی اور یہ رخصتی ۱۲ر فروری ۱۹۴۹ء تک پھیل گئی، اس کے بعد مولانا نے ندوہ استعفیٰ بھیج دیا۔ ان سوا تین سالوں میں مولانا پوری شدت کے ساتھ تبلیغی کام میں منہمک رہے، بھوپال ریاست کا کونہ کونہ چھان مارا، برار کے زبردست دورے کئے، بمبئی کے دورے کئے، حیدرآباد کے نوابی شہر میں کام کو خوب خوب جمایا، کسی بھی اہم آدمی سے تبلیغ و دعوت کے تعارف کے لئے مولانا یوسف صاحبؒ کے زمانہ میں آپ کو استعمال کیا جاتا تھا۔

بھوپال کا پہلا اجتماع:

جب بھوپال واطراف میں کام خوب جم گیا اور اس بات کا اندازہ ہو گیا کہ اب یہ لوگ دعوت کا بار امانت اٹھا سکتے ہیں، خود عمل کر سکتے ہیں اور دوسروں تک پہنچا سکتے ہیں تو حضرت جی مولانا یوسف صاحب سے بھوپال کے اجتماع کی تاریخ لی گئیں، ۲۴ تا ۲۶ر دسمبر ۱۹۴۸ء کو پہلا اجتماع ہوا، خدا نے اس اجتماع کو ایسی مقبولیت بخشی کہ وہ پھر ۵۳ سال تک تاج المساجد میں ہوتا رہا، ۲۰۰۱ء میں تاج المساجد میں آخری اجتماع ہوا تھا۔

بھوپال کے اجتماع کی خصوصیات:

بھوپال، وسط ہند میں واقع ہے۔ سردیوں میں یہاں کا موسم معتدل ہوتا ہے، دار العلوم تاج المساجد کا ہر کام دار العلوم اور اجتماع کو دیکھتے ہوئے بنتا تھا، دار العلوم تاج المساجد میں مسلسل اجتماع ہونے کی وجہ سے ایسی سہولتیں پیدا ہو گئی تھیں جو کہ اجتماع میں

بمشکل ہوں گی۔اس اجتماع میں تاجر پیشہ، نئے لوگ اور جنوبی ہندوستان کے لوگ خاص طور پر شریک ہوتے تھے جو ابتداء میں زیادہ مشقتیں اٹھانے کے عادی نہ ہوتے تھے، ابتداء میں ۵۰۰۰ ہزار آدمی شریک ہوئے تھے اور آخری اجتماع میں تقریباً ڈیڑھ لاکھ لوگوں کا ہجوم تھا۔

۱۔ پہلے اجتماع اور تاج المساجد میں دار العلوم کے قیام سے پاکستان بھاگنے والے لوگوں کے قدم جم گئے، مسلمانوں کی ڈھارس بندھ گئی، ورنہ شاید اس علاقے میں کوئی بھی مسلمان باقی نہ رہتا، خود مولانا عمران خان کو رئیس احمد جعفری ندوی جو مولانا کے دوست اور بڑے تھے پاکستان ہجرت کر گئے تھے اور وہاں ان کا مقام تھا مولانا کو خط لکھا کہ یہاں آجاؤ میں تم کو مفتی قاضی بنوادوں گا، مولانا نے لکھا کہ میں تو سب کچھ بن جاؤں گا لیکن بھوپال کی مسجدوں میں گھوڑے بندھیں گے۔منع فرمادیا کہ یہاں اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کے بہت سے مواقع ہیں۔

۲۔ ریاست کے خاتمہ کے بعد دار العلوم تاج المساجد کے قیام اور اجتماع کے انعقاد نے اس دینداری کی فضا کو قائم رکھنے بلکہ ترقی دینے میں بڑا اہم کردار ادا کیا تھا جو کہ بھوپال کی مسلم ریاست کا خاصہ تھی، یہ صحیح معنی میں دینداروں کی بہت عظیم الشان ریاست تھی جو دینی افکار و اعمال میں پورے برصغیر میں اپنا ثانی نہیں رکھتی تھی، نہ یہاں بدعتیں تھیں نہ قبر پرستی نہ جہالت تھی نہ دین سے بے خبری، ریاست ختم ہونے کے بعد اس ادارہ نے اس ذمہ داری کو نبھایا، حالانکہ آج کے دور میں علماء، مفتی اور قاضی حضرات نے اس طرف توجہ بہت کم کردی ہے اور انھوں نے اپنے لئے دوسری مشغولیتیں تلاش کرلیں ہی اس لئے برائیاں اور بدعتیں بہت تیزی سے فروغ پارہی ہیں۔

۳۔ دار العلوم کے قیام اور اس اجتماع کی برکت سے خدا نے تاج المساجد جیسی

عظیم الشان مسجد کی تکمیل کا سامان کیا۔

۴۔ اس اجتماع کی برکت سے دارالعلوم تاج المساجد کا تعارف بہت جلد پوری دنیا میں ہوگیا۔ جس کا اس کو بہت نفع ہوا۔

۵۔ تاج المساجد، دارالعلوم اور اجتماع کی وجہ سے اصحاب اقتدار اس ادارہ کی اہمیت جانتے اور مانتے ہیں، ایک بار مولانا عمران خان نے عزت مآب ارجن سنگھ صاحب سے فرمایا کہ ہمارے دارالعلوم، اجتماع اور اس عظیم مسجد کی وجہ سے پوری دنیا میں ہندوستان کے سیکولرزم کا پرچار ہوتا ہے اور آپ کی تصویر خوشنما بنتی ہے، آپ کے کارندے ہم کو پریشان کرتے ہیں، ان کو تو ہماری قدردانی کرنا چاہئے۔

۶۔ دوکانداروں اور ہوٹل والوں میں اجتماع کے عام دینی ماحول سے ایمانداری کا جذبہ پیدا ہوتا ہے وہ لوگ صحیح بھاؤ رکھتے ہیں، لوگ خود کھانا کھا کر اپنا حساب بتا کر ادائیگی کر دیتے ہیں۔

تکمیل تاج المساجد:

مولانا محمد عمران خاں کو بہت شروع سے اس مسجد کی تکمیل کی فکر تھی وہ اکثر حسرت بھری نظروں سے دیکھا کرتے تھے کہ اس کی تکمیل ہوگی کہ نہیں یا یہ عظیم الشان مسجد یوں ہی ڈھا جائے گی، آپ اگرچہ نواب حمید اللہ اور ساجدہ سلطان صاحبہ سے موقع بموقع تلخ اور صحیح باتیں فرمایا کرتے تھے اور ان کے کاموں پر تنقید کیا کرتے تھے اور یہ مولانا کے خاندان کے بڑوں کا ان پر اثر تھا اور وہ لوگ مولانا کے مقام کو جان کر ان کی بات اہتمام سے سنتے بھی تھے، یہ سب باتیں مولانا ان لوگوں کے سامنے کہتے تھے، لیکن اندر سے ان کی دینداری اور اسلامی خدمات کو بہت سراہتے تھے، وہ اکثر ایسے مواقع پر لوگ نواب حمید

اللہ خاں پر بے ضرورت تنقید کرتے تو آپ فرماتے تھے کہ وہ بہت اچھے حکمراں تھے۔ان کا موازنہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ سے نہ کیا کرو، وہ حکمرانوں میں بہت اچھے تھے۔تاج المساجد کی تعمیر پر شاہجہاں بیگم نے بے پناہ مصارف کئے تھے، تقریبا ۱۴-۱۵لاکھ روپے۔ کیونکہ وہ اسے مسجدوں کا تاج بنانا چاہتی تھیں مولانا منظور نعمانیؒ ''الفرقان'' میں تحریر فرماتے ہیں کہ بھوپال کے حضرات سے سنی ہوئی یہ بات بھی یاد آرہی ہے کہ اس وقت تک مسجد کی تعمیر پر ۱۴/لاکھ روپے خرچ ہو چکے تھے جو آج کل کے حساب سے ۱۴/کروڑ سے کم نہیں ہوں گے۔(الفرقان جنوری ۱۹۹۷ء صفحہ ۳۴)

دارالعلوم تاج المساجد کے قیام کے بعد کچھ نہ کچھ تعمیری اور مرمتی کام ہوتے رہے،اس کی تکمیل کی فکریں ودعائیں جاری تھیں ۱۹۶۸ء میں حضرت صاحبؒ نے اصرار فرمایا کہ آپ مسجد کی تکمیل میں جٹ جاؤ اور کینیا میں جا کر دارالعلوم کے اہل تعلق سے بڑی رقم لاکر ابتداء کردو پھر کرامت ظاہر ہوگی، کیونکہ کام رکا ہوا ہے، لوگ مایوس ہیں، یہ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک مجذوب کہتا پھرتا تھا کہ نہیں بن سکتی نہیں بن سکتی تاج المساجد نہیں بن سکتی۔

مولانا تشریف لے گئے اور کینیا میں حالات بہت ناگفتہ بہ تھے لیکن مطلوبہ رقم دو لاکھ وصول ہوئی اور ۲۴/اپریل ۱۹۷۱ء کو تاج المساجد کا باقاعدہ کام شروع ہوا، مولانا سید منظور حسین سرش نائب امیر دارالعلوم انچارج تعمیرات جدید اور مولانا سلمان خان صاحب نگراں تعمیرات مقرر ہوئے، انہوں نے اس محنت، جانفشانی اور دلسوزی سے کام کیا کہ خرچ بجائے بڑھنے کے اور کم ہوگیا، مولانا نے پورے ہندوستان اور باہر لیبیا، کویت، انگلینڈ، کینیڈا اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے دورے کئے اور آج سے ۴۰ سال پہلے اتنی بڑی رقمیں وصول کیں جو اس وقت ناممکن نظر آتی تھیں۔

آخر میں دو سعادتیں خدا نے میرے لئے بھی مقرر کی تھیں، دبئی کی شہزادی مریم بنت

راشد اور دیگر دبئی کے اہل خیر حضرات سے ۱۹۸۰ء میں ۱۵/لاکھ روپے تاج المساجد کی تعمیر کی لئے وصول کئے اور اس سے تاج المساجد کے صدر دروازہ کی تعمیر مکمل ہوئی، دوسری سعادت یہ تھی کہ تاج المساجد کی اصل بلڈنگ کی چھت کا کام جو ۱۹۷۱ء سے ۱۹۹۹ء تک مشوروں کے بیچ میں جھولتا رہا کہ پتھر کی سلوں پر جو ملبہ مٹی اور اس زمانے کے مسالے ہیں اگر ان کو کھودا جائے گا تو پتھر کی سلیں ٹوٹ جائیں گی اور اوپر سے دوسری سمنٹ کی چھت ڈالی جائے گی تو مسجد کی چھت پر زبردست وزن بڑھ جائے گا، پھر خدا کی توفیق سے ۱۹۹۹ء میں ایک دن اوپر چھت پر سنبھال سنبھال کر چھینی سے کھودا گیا تو ملبہ آسانی سے نکلتا چلا گیا، ۳۔۳، ۴۔۴ فٹ ملبہ کھود کر نکالا گیا تقریباً ۱۰۰ ٹرک بیکار ملبہ نکلا، اس کے بعد پتھروں پر مضبوط سمنٹ کی چھت ڈالی گئی، اس طرح تکمیل کا کام پورا ہو گیا۔

لیکن کیونکہ سمنٹ کا کام پائیدار نہیں ہوتا اور ہر ۲۰ سال میں مرمتی کام کرنا ضروری ہے اس لئے موجودہ امیر مولانا محمد سعید صاحب مجددی کے زمانے میں دونوں میناروں کی مرمت کا کام جاری ہے جس میں موجودہ مہنگائی کے دور میں بہت خرچ ہو رہا ہے۔

ایشیاء کی عظیم ترین مسجد کی تکمیل مسلمانوں کی عالی حوصلگی کی دلیل ہے کہ مسلمانوں میں آزادی کے بعد کے حالات میں اتنا دم ہے کہ وہ اتنا بڑا کام کر سکتے ہیں اس سے مسلمانوں کے حوصلہ اور ہمت کو بے پناہ پرواز ملی، اور تکمیل تاج المساجد کی مہم کے بعد بھوپال کی ہر بڑی چھوٹی مسجد کی تعمیر جدید ہوئی اور ہر شخص یہ کہتا نظر آتا ہے کہ جب تاج المساجد بن سکتی ہے تو ہمارا کام تو تھوڑا سا کام ہے آسانی سے پورا ہو جائے گا۔

سید صباح الدین عبدالرحمٰن اس اجمال کی تفصیل بیان کرتے ہیں وہ تحریر فرماتے ہیں:

"وہ (مولانا عمران خان) بھوپال کے رہنے والے تھے، ۱۹۴۷ء کے بعد جب بھوپال کا فرماں روا خاندان بھوپال چھوڑ کر دوسری جگہ پناہ گزیں ہو گیا تو مولانا عمران

خان ندوی نے اپنی قوت ارادی کو بروئے کار لاکر بھوپال کے لوگوں کے دلوں پر اپنی فرماں روائی شروع کردی اور یہ نمونہ پیش کیا کہ تاج وتخت کے بغیر بھی اخلاص کی پاکیزگی، نیت کی طہارت اور عمل کی پختگی کے ساتھ فرماں روائی ہوسکتی ہے۔

انہوں نے تاج المساجد کی تعمیر جس طرح ازسرنو کی اور اس کی زینت اور آرائش میں جس طرح اضافہ کیا، اور پھر اس کے ذریعہ سے جو دینی حمیت اور ایمانی حرارت پیدا کی وہ ایسا کارنامہ ہے کہ دنیا کی بڑی مسجدوں کی تعمیر کی جب تاریخ لکھی جائے گی تو ان کا نام نامی بھی اس تاریخ میں ضرور لکھا جائے گا، مسجدیں تو شاہی خزانوں اور حکومت کی مالی امداد سے بنتی رہیں لیکن تاج المساجد کی تعمیر مولانا عمران خان ندوی کے کاسۂ گدائی سے انجام پائی یہ اس کی مثال ہے کہ کاسۂ گدائی کو جام جمشید کس طرح بنایا جاسکتا ہے، تاج المساجد کو بھوپال کا فرماں روا خاندان اپنے خزانہ سے نہ بنا سکا لیکن مولانا محمد عمران خان نے اسکو پایہ تکمیل تک پہنچا کر یہ مثال پیش کی عمل پیہم ہو تو آسمان بُن برسا سکتا ہے اور زمین دولت اگل سکتی ہے" (معارف، نومبر، ۱۹۸۶)

مولانا کی تقریر کا دلنشیں انداز:

مولانا علیہ الرحمہ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ بھئی مجھے تقریر تو آتی نہیں، لفاظی اور جوش و جذبہ کے انداز کے بجائے جو کہ مقررین حضرات کا خاصہ ہے، میں تو صرف کام کی باتیں کرتا ہوں، آپ کی تقریر کا خلاصہ عمل پر ابھارنا اور بے عملی سے بچانا ہوتا تھا، آپ کی ہر تقریر کا مقصد معاملات کی اصلاح ہوتا تھا، آپ کی کوششوں سے لوگوں کی بہت اصلاح ہوئی، آج اس طرح کے انداز کی بہت ضرورت ہے کہ لوگوں کے معاملات اچھے ہوں، عوام نہیں بلکہ خواص اور علماء بھی بدعملی اور لفاظی کا شکار ہیں۔

پروفیسر اخلاق اثر صاحب نے مولانا مرحوم کا انٹرویو لیکر اور ملاقات کے نام سے چھاپ کر مولانا کی آپ بیتی لوگوں کو سنادی وہ مولانا عمران خاں صاحب کی تقریروں اور ان کے تأثیر پر قلم اٹھاتے ہوئے لکھتے ہیں، ''مبالغہ نہ ہوگا اگر یہ کہا جائے کہ یہی تأثر ہر پڑھے لکھے نوجوان کا مولانا مرحوم کے بارے میں ہے اور ان سب سے بڑھ کر اتوار کے جلسہ کے اجتماع میں حضرت مولانا محمد عمران خان صاحب کی تقریروں کا بڑا اثر ہوا۔''

''مولانا چھ نمبروں کے ساتھ اسلاف کے کارنامے بھی بیان فرماتے اور عہد جدید سے ان کا تعلق جوڑتے، ہمارے سامنے ایک معیار بھی آجاتا اور اصلاح کی امید کی کرن روشن ہوجاتی، معمولی صورت وشکل کے لڑکوں کی شادی کے لئے ویسی ہی لڑکیاں بھی پسند کرنے پر زور دیتے، بی بیوں کے بے نمازی ہونے پر سختی کرنے سے منع فرماتے کہ شوہروں نے بھی دوسروں کے ہزاروں چکروں کے بعد نماز شروع کی تھی، حضرت بلالؓ کے بارے میں فرماتے کہ وہ بدصورتی کا بہترین نمونہ تھے مگر رسول خدا کے حکم پر ان کی شادی کے لئے سیدوں کی بستی میں انکار ممکن نہ تھا، وہ سید، پٹھان، شیخ وصدیقی کی تفریق پر کاری ضرب لگاتے، پڑوسیوں کے حقوق پر زور دیتے اور فرماتے ہم پڑوس میں بیماروں پر توجہ نہیں دیتے اور صاحب اقتدار کے لئے اتنا پریشان وفکرمند رہتے ہیں کہ کھانسی کی آوازیں سن کر مزاج پرسی کے لئے پہنچ جاتے ہیں۔

بیویوں کے اکرام پر زور دیتے کہ ہم نے ان کو لواؤں سے بدتر سمجھ رکھا ہے، صفائی اور طہارت کے فرق پر دلچسپ واقعات بیان فرماتے کہ محفل میں شریک لوگوں کے لئے آداب مجلس کا خیال رکھنا مشکل ہوجاتا، مولانا اصلاحی روح بیدار کرتے عظیم مقاصد اور کشادہ قلبی کے لئے شاہین وکرگس کا موازنہ پیش کرتے اور اقبال کے اشعار سے تقریر میں زور پیدا کرتے، جدید تہذیب کے غیر اسلامی عناصر پر حملہ کرتے اور اکبر الہ آبادی

کے طربیہ اشعار جھوم کر پڑھتے، حضرت مولانا کے ایک جملہ سے محفل قہقہہ زار بن جاتی اور دوسرے جملے سے وہ اور ہم سب آبدیدہ ہو جاتے، اللہ پاک نے عجیب صلاحیتیں عطا کی تھیں، دعوت وتبلیغ بڑی تفصیل سے بیان فرماتے اور رگوں میں گرم خون کی رفتار بڑھ جاتی، ہم لوگوں کی ہمیشہ یہی خواہش ہوتی کہ مولانا ہر محفل سے خطاب فرمائیں، نوجوانوں کے اجتماع میں مولانا حضرت مصعب بن عمیرؓ کے واقعات بیان فرماتے کہ قبول اسلام سے قبل ان کی زندگی کتنی شاہانہ تھی پھر فرماتے کہ ایک بار حضور اکرم ﷺ کے سامنے حضرت مصعب بن عمیرؓ اس طرح گزرے کہ ان کے پاس ایک چادر تھی جس پر کئی جوڑتھے، ان میں ایک چمڑے کا جوڑ تھا، حضرت مولانا حضور اکرم ﷺ کے آبدیدہ ہونے کا ذکر فرماتے خود روتے اور ہم لوگوں کو رلاتے ہمارا جی چاہتا کہ ہم بھی ان کی طرح قربان ہو جائیں، ہم لوگوں کی عجیب حالت ہوا کرتی تھی۔" (ملاقات صفحہ ۹ تا ۱۱)

مولانا کی تألیفات اور تحریریں:

مولانا محمد عمران خان کو لکھنے کا بہت اچھا ذوق تھا، تحریروں میں بھی تقریروں کی طرح سوسائٹی کی بے راہ روی اور فساد پر شدت سے تنقید فرماتے تھے، ندوہ کے میگزین "الندوہ" اور عربی مجلہ "الضیاء" میں آپ مقالے تحریر فرماتے تھے، مصر سے واپسی کے بعد مولانا رئیس احمد جعفری کی ادارت میں نکلنے والے اخبار "ہندوستان" میں مقالات کا ایک سلسلہ شروع کیا تھا، اور گذشتہ صدی کے چوتھے اور پانچوے دہے میں نکلنے والے اخباروں اور رسالوں میں برابر آپ کی تحریریں طبع ہوتی رہتی تھیں، آپ نے ایک مفصل مضمون جامعہ ازہر پر تحریر فرمایا جو ماہنامہ "الندوۃ" مئی ۱۹۴۰ء میں چھ قسطوں میں چھپا، مولانا پروفیسر مسعود الرحمٰن خاں صاحب نے حیات عمران، میں صفحہ ۲۶۵ سے ۲۶۷

تک تین صفحات میں مولانا کی نگارشات کی ایک فہرست مرتب کر کے درج کی ہے جو بہت مفید اور معلومات سے پر ہے۔

تالیفات: آپ کی تالیفات آپ کے خطاب کی طرح مختصر اور مفید ہوتی تھیں۔

۱۔ مأثور دعائیں:

اس میں رسول اللہ ﷺ سے منقول عائیں جمع کی گئیں ہیں، اس کو آپ نے ۱۳۶۷ھ میں تالیف کیا تھا، یہ بہت مقبول و مشہور کتاب ہے، ہر شخص اس کا ایک ایڈیشن جیب میں رکھتا ہے، اس کے ۴۰ سے زیادہ ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

مولانا کے چاہنے والوں کا بہت اصرار تھا کہ اس کو نئے انداز سے چھاپا جائے اور مولانا کی حیات مختصر طور پر اس میں شامل کر دی جائے، ان حضرات کی خواہش کی تکمیل راقم نے ۲۰۰۵ء میں کی، دو مضمون ایک مولانا کی حیات پر دوسرا مولانا اور تبلیغ پر تحریر کر کے دعاؤں سے پہلے منسلک کر دیا ہے تا کہ لوگ مولانا کے مختصر حالات آسانی سے جان سکیں۔ آپ مقدمہ میں فرماتے ہیں کہ:

''رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں یہ بات واضح نظر آئے گی کہ سخت سے سخت حالات میں بھی حضور ﷺ کا سب سے بڑا سلاح دعاء تھی، دعاء کے الفاظ اور اس کے معانی کی جامعیت اور مانگنے والے کے خلوص وللہیت کا عجب اثر ہوتا تھا، اور شاید ایسے شدید موقعوں پر حضور ﷺ کو فتح و نصرت کی بشارتیں دی جاتی تھیں۔'' (مأثور دعائیں صفحہ ۶)

مأثور دعاؤں کے معانی سمجھ کر مانگنا قبولیت کے زیادہ قریب ہے اور اس کی مثال ایسی ہے کہ کوئی حاکم یا بادشاہ صدائے عام دے کہ جو کچھ مانگنا ہو مانگو دیا جائے گا اور مہربانی سے درخواست کا مسودہ بھی بتا دے، تو ایسی صورت میں مانگنے والا مضمون تیار

کرنے اور آداب شاہی کے بموجب الفاظ تلاش کرنے کی کاوش سے بچ جائے گا یہی کیفیت ماثور دعاؤں کی ہے۔(ماثور دعائیں صفحہ،۷)

اس مختصر مجموعہ میں چند ماثور دعاؤں کو اس لئے جمع کیا گیا ہے کہ طویل اور مبسوط دعاؤں کے مجموعوں کو جو لوگ یاد نہیں کر سکتے وہ بے حد اہم اور ضروری دعاؤں کو کم وقت میں تھوڑی توجہ سے یاد کر سکیں اور موقع پر ان کی برکات سے مستفید ہو سکیں۔(ماثور دعائیں صفحہ،۸)

۲۔ نماز فضائل و مسائل:

اس میں نماز کے فضائل اور مسائل مختصر طور پر بیان فرمائے ہیں تاکہ ہر انسان آسانی سے انہیں یاد کر لے اور تمام اوراد و اذکار اور بعض آیات کا اردو میں ترجمہ کر دیا گیا ہے تاکہ سمجھ کر پڑھے۔

۳۔ مشاہیر اہل علم کی محسن کتابیں:

یہ کتاب ۱۹۴۶ء میں تالیف کی گئی ہے اس میں مقالات کا وہ مجموعہ شامل کیا گیا ہے جو اس موضوع پر ہندوستان کے بڑے علماء کی طرف سے تحریر کئے گئے تھے اور "الندوۃ" میں چھپے تھے، علماء نے یہ تحریر کیا تھا کہ وہ کس کتاب سے سب سے زیادہ متاثر ہوئے، اس کتاب میں دو نئے مقالے بھی شامل کئے گئے ہیں۔ایک مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اور دوسرا مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا۔

مولانا عمران خان نے اس پر فاضلانہ مقدمہ تحریر کیا ہے اور اپنی عادت کے مطابق ادب نافع اور صالح کی تخلیق پر زور دیا ہے تاکہ بداخلاقی کے زبردست سیلاب سے حفاظت ہو سکے، کتاب معارف اعظم گڑھ کے مطبع سے طبع ہوئی ہے۔

۴۔ مطالعہ سلیمانی:

سید سلیمان ندویؒ کے سمینار کے مقالوں کا مجموعہ مرتبہ راقم ومولانا پروفیسر مسعود الرحمٰن خان صاحب جو ''مطالعہ سلیمانی'' کے نام سے طبع ہوا، اس میں بھی بڑی اہم نصیحتیں اور ہدایتیں ہم لوگوں کو دی جاتی تھیں۔

۵۔ ''نشان منزل'' کا اجرا:

نشان منزل ایک دینی واصلاحی دس روزہ اخبار کے طور پر ۳۰ر نومبر ۱۹۴۸ء مطابق محرم الحرام ۱۳۶۸ھ کو مولانا عمران خانؒ کی زیر سرپرستی اور جماعت ہدایت المسلمین کے بینر کے تحت نکلا تھا، کیونکہ اس جمیعت کا مقصد اس رسالہ کے ذریعہ مسلمانوں میں عملی اور دعوتی سرگرمیاں بڑھانا تھا، یہ پہلا رسالہ ہے جس نے علمی اعتبار سے تبلیغ کے فروغ میں خاص طور پر بھوپال، مغربی اور جنوبی ہندوستان میں بڑا حصہ لیا، بعد میں یہ ۱۵ر روزہ رسالہ بن کر شائع ہونے لگا اور تقریباً دو سال بعد جب دارالعلوم تاج المساجد کی تأسیس ہوگئی تو یہ اس کا بھی ترجمان ہوگیا اور ۱۹۸۸ء تک پابندی سے شائع ہوتا رہا، اس پرچہ کا مقصد بھوپال کے مسلمانوں کو علم وعمل پر ابھارنا اور اس علاقہ کی فکری قیادت سنبھالنا تھا۔

اس رسالہ نے دارالعلوم تاج المساجد کے فارغین اور فضلاء میں لکھنے کا ذوق پیدا کیا، اس ادارہ کے جو بھی اصحاب قلم آج ہیں ان سب نے اس پرچہ سے لکھنا سیکھا ہے، بعض اصحاب نے اردو کے ترجمہ کا فن اس سے سیکھا ہے۔

مولانا محمد عمران خان ندویؒ برابر اس پر اپنی توجہ صرف کرتے تھے اور ایڈیٹران کو ہدایات دیتے تھے کہ کس طرح کے مضامین شائع کریں، مختصر مضامین پر بڑا اصرار فرماتے تھے، اس طرح وہ پروپیگنڈہ کے خلاف تھے، وہ چاہتے تھے کہ پرچہ پر دارالعلوم سے خرچ

کرنے کے بجائے خود اس کے خریداروں کے ذریعہ اسے چلایا جائے، اس تمام تفصیل کے بعد یہ کہنا ناگزیر ہے کہ مولانا کے مزاج میں انتظام اور اداروں کے قیام کی زیادہ اہمیت تھی، جس طرح علامہ شبلی نے مولانا مسعود علی صاحب ندویؒ کو تحریر کیا تھا کہ ''تم عملی آدمی ہو اس لئے قومی اشغال میں اہل قلم سے تمہاری زیادہ ضرورت ہے۔''

(مکاتیب شبلی ۲/۱۱۹)

مولانا عمران خان سے کسی نے یہ نہیں کہا لیکن انھیں خود احساس تھا کہ لکھنے پڑھنے والے طبقہ علماء میں بہت ہیں، لیکن وہ لوگ جو سلیقہ سے ادارے بنا سکیں اور پھر سلیقہ سے انہیں چلا سکیں بہت کم ہیں، وہ کبھی کبھی اس بات کو برملا کہہ بھی دیا کرتے تھے۔

ایک بار پروفیسر مرتاض جونوساری گجرات میں فارسی کے پروفیسر تھے اور مولانا کے بہنوئی تھے انہوں نے مولانا کو لکھا کہ کاش آپ نے کوئی کتاب لکھی ہوتی تا کہ لوگ اس کو یاد رکھتے اور اس سے استفادہ کرتے، مولانا نے ان کو جواب دیا کہ میں نے تاج المساجد کی تالیف کردی ہے، اس سے لوگ سبق حاصل کریں گے۔

☆☆☆

ڈاکٹر جلیل الرحمٰن صدیقی

ریاست بھوپال کے دورِ اول کا صاحب دیوان اسلامی شاعر

ایک دور ایسا بھی تھا جب علاقائی اور مقامی ادب اور اس سے وابستہ اہم شخصیتوں کے کارناموں اور تحقیقی و تنقیدی جائزے کی طرف خاص توجہ نہیں دی جاتی تھی کتنے ہی علاقے ایسے تھے جن کے علمی و ادبی خزانے گوشۂ تاریکی میں گم تھے اور وہاں کے اساتذۂ سخن اور علماء و ادباء گمنامی کی زندگی جی کر ایسے وقت کے قلزم میں ڈوبے کہ ان کا کوئی نام لینے والا بھی نہ رہا۔ بہت ہوا تو یہ کہ علاقائی طور پر ان کی شہرت کا ڈنکا تو بجا، لیکن یہ شہرت ان کے اپنے علاقے سے آگے نہیں بڑھ سکی۔ لیکن دھیرے دھیرے برف پگھلی اور تحقیق کے پھیلاؤ کے ساتھ علاقائی ادب اور ان ادیبوں، شاعروں کے کارناموں پر توجہ دی جانے لگی جو ابھی تک قعرِ گمنامی میں تھے۔

بھوپال کے علاقائی ادب کی طرف سب سے پہلے ارشد تھانوی نے توجہ دی اور ''بھوپال کی فضائے شعری'' کے ذریعہ یہاں کے شعری ادب پر روشنی ڈالی لیکن ڈاکٹر سلیم حامد رضوی نے ''اردو ادب کی ترقی میں بھوپال کا حصہ'' لکھ کر ابھی تک بھوپال جو

ادبی وشعری سرمایہ اور جواد یب، شاعر دنیا کی نظروں سے پوشیدہ تھے ان کے کمالات کو سیاہ سفید کے درمیان محفوظ کرنے کا کارنامہ سرانجام دیا۔

ڈاکٹر سلیم حامد رضوی کے مقالے سے یہ بات بھی ثابت ہوئی کہ اس علاقے میں علم و ادب اور شناخت کے ابتدائی دور میں ادبی میدان میں ہراول دستے کے پیش رو قاضی سید محمد صالح (بیرسیہ) قاضی محمد معظم (رائسین) اور مفتی محمد خیراللہ صدیقی بھی تھے اور وہ اس علاقے کی زبان وادب کے نمائندہ قرار دیے گئے۔

ڈاکٹر سلیم حامد رضوی صاحب نے اپنے مقالے کے دور اول میں قاضی سید محمد صالح، قاضی محمد معظم اور مفتی خیراللہ صدیقی کو اس علاقے میں اردو کے ابتدائی صورت گروں کے مختصر تعارفی خاکے ہی پیش کیے، لیکن ان کے ادبی کارناموں کو مدنظر رکھتے ہوئے ضرورت اس بات کی تھی کہ الگ الگ ان کے کارناموں پر کام کو آگے بڑھایا جائے تاکہ ان کی ادبی شخصیت پوری طرح واضح ہو سکے۔ اسی کے ساتھ تاریخ ادب میں ان کے صحیح مقام کو متعین کیا جا سکے۔ یہی نہیں بلکہ اس ضرورت کا بھی احساس ہوا کہ ان عظیم شخصیتوں کے بعد قاضی یا مفتی خاندانوں میں علم وادب کا جو دریائے فیض جاری رہا اور اردو ادب کی ترقی میں ان کے وارثوں نے جس طرح حصہ لیا اور بھوپال کی علمی و ادبی دنیا کو اپنی نگارشوں اور کاوشوں سے سرخرو کیا، اسے بھی منظر پر آنا چاہئے۔ یہی وہ عوامل تھے جو میرے اس مقالے کی تحریک کا باعث بنے، جیسا کہ ڈاکٹر سلم حامد رضوی کی تحقیق سے ظاہر ہوتا ہے کہ قاضی سید محمد صالح کی اردو ادبی خدمات کم وبیش ڈھائی سو سال کی تخلیقی کاوشوں پر محیط ہیں۔

اس علاقہ مالوہ میں اور خصوصیت کے ساتھ اس دور میں (بیرسیہ) میں اور اس کے اطراف میں قاضی سید محمد صالح کی ادبی اور تاریخی حیثیت اردو زبان وادب کے پہلے

دریافت شاعری کی ہے۔ڈاکٹر سلیم حامد رضوی کی تحقیق کے مطابق بھوپال میں دورِ اول کی ادبی تخلیقات کا ''دورِ اول اٹھارویں صدی کے ساتھ ساتھ شروع ہوتا ہے۔اور تقریباً پوری صدی پر پھیلا ہوا ہے۔

اس دور میں جو خالص مذہبی مثنویاں لکھی گئی ہیں، ان میں قاضی سید محمد صالح (بیرسیہ) نے اک طویل ''مثنوی اخلاق'' تصنیف کی۔اس میں اسلامی اخلاق کو نہایت ہی سادہ اور آسان زبان میں نظم کیا گیا ہے۔(ص:۵۲) ڈاکٹر صاحب کی اس متذکرہ تحریر سے یہ بات بھی سامنے آئی کہ وہ صرف شاعر ہی نہیں تھے۔ادیب بھی تھے اور زبان پر قدرت رکھتے تھے۔اسی کے ساتھ یہ بھی ظاہر ہوا کہ قاضی صاحب کی صرف ایک ہی مثنوی نہیں تھی۔اس موضوع پر اور بھی مثنویاں تھیں جو اوراق ڈاکٹر صاحب کو دیمک خوردہ اور منتشر حالت میں ملے وہ اوراق پڑھے بھی نہ جاسکے اور نہ ان کے صفحات کو ترتیب دیا جاسکا۔

ڈاکٹر سلیم حامد رضوی صاحب، قاضی سید محمد صالح کی ''مثنوی اخلاق'' کی اردو زبان و ادب میں تاریخی اہمیت اور اس کے زبان و بیان کی خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> ''قاضی صاحب اردو، فارسی اور ہندی کے شاعر بھی تھے۔ان کے خاندان میں ان کی شاعری کے نمونے منتشر اوراق کی صورت میں اب تک موجود ہیں۔ان میں ''مثنوی اخلاق'' ہے۔تصنیف ۱۱۱۹ھ مطابق ۱۷۰۷ء ہے جس میں اسلامی اخلاق کو نظم کیا ہے۔اس مثنوی کو دیکھنے کے بعد یہ کہنا پڑتا ہے کہ شمالی ہند کے ان علاقوں میں جہاں مسلمان زمانہ قدیم سے آباد تھے، اردو ادب کی منزلیں دلی سے بہت قبل طے

کر چکی تھی اور یہاں کی شعر و شاعری دلّی اور رنگ آبادی کے اثرات اور تحریکات کی مرہونِ منت نہیں ہے۔ قاضی صاحب کی مثنوی خالص مذہبی رجحانات کی ترجمان ہے۔ جہاں تک ان کی تخلیقات کا تعلق ہے ان کو دیکھ کر کہنا پڑتا ہے کہ وہ شاعری کو محض مذہبی تعلیم کا ذریعہ قرار دیتے تھے۔ان کی زبان جو اس مثنوی میں نظر آتی ہے ۱۱۱۹ھ بمطابق ۱۷۰۷ء کی وقتی پیداوار نہیں بلکہ کم از کم دو سال کے ادبی ارتقاء کا نتیجہ ہے۔ یہ وہی صاف اور سادہ زبان ہے جو ہمیں دلی میں پچاس سال کے بعد ملتی ہے۔ان کی زبان کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں دکنی اثرات نفی کے برابر ہیں۔ دوسری اہم خصوصیت تسلسل ہے جو قاضی صاحب کے تربیت یافتہ ذہن کا پتہ دیتی ہے، مثنوی کے درمیانی اوراق گم ہو چکے ہیں۔ پھر بھی جو حصہ ملا ہے، اس میں ۱۶۵، اشعار ہیں جن کو اچھی طرح پڑھا جا سکتا ہے۔"

(ڈاکٹر سلیم حامد رضوی، اردو ادب.....ص:۷۵،۷۶)

ڈاکٹر سلیم حامد رضوی کی متذکرہ تحقیقی تحریر سے یہ بات تو واضح ہو گئی جیسا کہ انہوں نے اپنے پہلے باب میں قاضی سید محمد صالح کو اردو زبان و ادب کا پہلا دریافت شاعر ظاہر کیا ہے اور اردو زبان کے ابتدائی سفر کے میل کا پتھر قرار دیا ہے۔

اسی باب میں قاضی معظم اور مفتی خیر اللہ صدیقی بھی شامل ہیں، جو کم و بیش چند سالوں کی مدت کے فرق سے الگ الگ ضرور ہیں لیکن اردو زبان کے ابتدائی صورت گروں میں شامل ہیں ان کی تصانیف "تفسیر القرآن" اور "فقہ ہندی" میں چند یکسانیت کے پہلو نظر آتے ہیں۔ مثلاً متذکرہ مثنویوں کے موضوعات دینی ہیں اور اخلاقیات کا درس دیتے

ہیں۔ مصنفین نے تعلیم اور درس وتدریس کے پیش نظر ان کو تحریر کیا ہے۔ ان خصوصیات نے ڈاکٹر صاحب کے اس باب کو ارتقائی ادب کے سنہرے باب کا درجہ عطا کیا ہے۔ جو اگلی منزل کا آئینہ دار ہے۔

اس سے پہلے کہ آگے ہم قاضی سید محمد صالح کی زبان دانی اور ان کی شاعری کی خصوصیات پر تفصیلی نظر ڈالیں بہتر ہوگا کہ قاضی سید محمد صالح کے خاندانی حالات اور اس خاندان کی ہندوستان میں آمد، ان کے ابتدائی قیام وسکونت کا تعین کرسکیں۔ اس ضمن میں قاضی سید محمد صالح کے ہندوستان میں وارد خاندان کی آمد پر رضوان الدین صاحب کی نئی دریافت ''لمۃ الانساب'' اپنے طور پر وقیع اور مستند کتاب ہے۔ جو اس وقت علم وادب اور تحقیق کے میدان میں ایک عظیم کارنامہ ہے۔ ایسی صورت میں جب کہ ہم اس علاقے اور زمانہ قدیم میں گذری ان عظیم المرتبت شخصیات کے دینی علمی اور ادبی کارناموں سے بالکل انجان اور بے خبر ہیں، ایسی صورت میں رضوان الدین صاحب کی یہ ذہنی کاوش اور کوشش نظم ''چراغِ راہ'' کی اس بڑھیا جیسی ہے جو اندھیرے میں چراغ لئے بیٹھی رہتی تھی اور راہ چلنے والوں کو راستے کا پتہ بتاتی رہتی تھی۔ اگر اردو، ہندی لٹریچر پر ریسرچ میں مصروف ریسرچ اسکالرز کے ذہن اس کتاب کی طرف رجوع ہوں تو یہ ان کے لیے انتہائی کارآمد اور سودمند ثابت ہوسکتی ہے۔

قاضی سید محمد صالح کے جد امجد اور ان کے خاندان سے تعلق رکھنے والے دیگر افراد خاندان جو بڑی تعداد میں تھے ''ہندوستان میں محمود غزنوی کے مسلسل اور لگاتار حملوں کے درمیان میں ہندوستان میں آئے۔ ان سبھی افراد خاندان کا پہلا مقام ''امبیٹھہ'' جو کہ سہارن پور (یوپی) میں ہے ان کا پہلا پڑاؤ یا سکونتی مقام قرار دیا گیا'' یہاں اس خاندان کے سکونتی مقام کے متعلق راقم السطور کو رضوان الدین انصاری سے اپنی تحقیق کو آگے

بڑھانے میں جو تاریخی وضاحت سامنے آئی جوان کی تحقیقی کتاب اور خود ان سے گفتگو کے دوران معلوم ہوئی۔

ڈاکٹر سلیم حامد رضوی کی تحقیق کے مطابق اس خاندان کا پہلا مقام امیٹھی تھا اسی وجہ سے انھوں نے قاضی محمد صالح (امیٹھوی) تحریر کیا ہے۔ رضوان الدین انصاری صاحب کی اس کتاب کے مطابق "امیٹھہ" اور "امیٹھی" دو الگ الگ مقام ہیں۔ "امیٹھہ" سہارن پور (یوپی) کے پاس بتایا جاتا ہے جو قدیم زمانے سے "تہذیب اور تمدن، علم و ادب کا مرکز رہا ہے۔" اور بیرون ملک سے اہل علم و فضل خاندان یہاں آکر آباد ہوتے رہے ہیں۔ جبکہ "امیٹھی" لکھنؤ کے پاس (یوپی) میں ہے۔

رضوان الدین صاحب کی تحریر کردہ کتاب "خاندانی شجرات اور تاریخ" کو پیش نظر رکھتے ہوئے اب یہ بات صاف ہو گئی ہے کہ قاضی سید محمد صالح کے جد امجد جب ہندوستان میں آئے تو ان کا پہلا مقام سکونت "امیٹھہ" ہی قرار پایا۔ بعد میں اس خاندان کا ایک حصہ "امیٹھی" میں منتقل ہوا۔ اس کے بعد یہ دونوں خاندان جو نسبتی رشتوں میں بھی منسلک تھے مختلف وقت اور حالات میں مالوہ میں داخل ہوئے۔ اس خاندان کے وہ افراد جو "امیٹھی میں منتقل ہوئے تھے اور انصاری کہلاتے تھے" دور عالمگیری کے ابتدائی ایام میں راجگڑھ میں جا بسے۔ جہاں وہ ہاں کے عہدہ قضاء پر فائز رہے اور اس خاندان کو جاگیر دی گئی۔

اس خاندان میں "قاضی محمد قتل انصاری کے پر پوتے قاضی عظیم الدین انصاری کی شادی قاضی سید محمد صالح کی دختر سے ہوئی" یہ وہ دور تھا جب مغل بادشاہ ہندوستان میں سریر آرائے سلطنت تھے۔

جہانگیر کی حکومت ۱۶۰۵ء سے ۱۶۲۷ء تک رہی۔ بعد ازاں شاہجہاں کی حکومت ۱۶۲۸ء

سے ۱۶۵۸ء تک رہی" جیسا کہ رضوان الدین انصاری کی تحریر سے ظاہر ہوتا ہے:

"۱۶۳۴ء میں اور چھا کے راجہ جھجھری سنگھ کے لڑکے بکرماجیت کے ساتھ آشٹہ میں زماں خان کی جنگ ہوئی۔ جس میں سید محمد زماں خان (برادر سید محمد صالح) نے شکست دی۔ جب سید محمد زماں خان دوراں (یہ خطاب تھا جو ان کو مغل دربار سے ملا تھا) رائسین سے باغی کی سرکوبی کے لیے چلے تو آپ نے شاہجہاں سے مدد کی درخواست کی سو شاہجہاں نے برہانپور سے رشید خان انصاری، بھائی سید قاضی محمد صالح اور دیگر افراد کو مدد کے لیے روانہ کیا۔ ۱۸ر فروری ۱۶۴۴ء کو قلعہ گنور کا محاصرہ ہوا۔ مارچ میں قبضہ ہو گیا۔ سید محمد زماں خانِ دوراں نے اپنے بھائی سید قاضی محمد صالح (بعد میں بیرسیہ میں مقیم ہوئے) کے انتظام میں دے دیا۔ جب وہ شاہجہاں کے حکم سے ۵۰۰، سواروں اور ۰۰ے، توپچی پیادوں کے ساتھ یہاں کے حاکم قلعہ دار مقرر ہوئے تھے۔ اسی کے پاس شاہ پور آباد تھا۔ قاضی سید محمد صالح بعد میں بیرسیہ میں مقیم ہوئے تھے۔" (خاندانی شجرات: ص، ۵۵۱)

جب قاضی محمد صالح قلعہ کے حاکم مقرر ہوئے اس وقت قلعہ گنور میں راجہ جسونت سنگھ اور راجہ عالم سنگھ قلعہ گنور کے محافظ تھے۔ بعد میں انھوں نے اسلام قبول کر لیا تھا جیسا کہ رضوان الدین صاحب کی کتاب سے ظاہر ہوتا ہے ان دونوں بھائیوں میں سے "راجہ جسونت سنگھ نے اپنا نام الہ داد شاہ رکھا اس کے بھائی عالم سنگھ نے اپنا نام خداداد شاہ رکھا" (خاندانی شجرات: ص، ۵۵۱)

قاضی محمد صالح نے قلعہ گنور کے دورِ قیام میں "قلعہ گنور میں ۱۶۴۶ء میں ایک مسجد تعمیر

کروائی تھی" (خاندانی شجرات: ص، ۵۵۱) قاضی محمد صالح کب تک قلعہ گنور کے قلعہ دار رہے، تاریخ کے کسی سلسلے میں کہیں یہ بات ظاہر نہیں ہوتی، قاضی محمد صالح کے قلعہ گنور کے حاکم مقرر ہونے کی تمام تر تاریخ رضوان الدین انصاری کی کتاب سے حاصل کی گئی ہے۔

مغل حکمراں اورنگ زیب کی حکومت ۱۶۵۸ء سے ۱۷۰۷ء کے بعد تک رائسین، راجگڑھ، بیرسیہ، بھوپال کے قصبات میں مقرر مفتی اور قاضی خاندان انہی خاندانوں کی مختلف شاخوں سے نسلاً بعد نسلٍ چلتے رہے۔ ان خاندانوں میں انصاری خاندان کے ایک فرد "ملا شیخ احمد المعروف ملاجیون جو کہ اورنگ زیب کے درباری تھے، کی سفارش پر ان قصبات میں بھیجے گئے تھے" قلعہ گنور کے حاکم شاہ عالم نے مغل حکمراں ۱۰۶۸ھ مطابق ۱۶۵۸ء میں معافی مانگ لی تھی" اور قلعہ گنور اس کو واپس کر دیا گیا اور قاضی سید محمد صالح بیرسیہ میں آبسے" (ص:۵۵۱) بہر صورت متذکرہ خاندانوں میں "امیٹھہ" میں مقیم خاندان قاضی محمد صالح کے بزرگوں کا اور "میٹھی" میں قیام پذیر خاندان انصاریوں کا ان دونوں خاندانوں کا مالوہ میں داخل ہونے اور ان کا مغل دربار شاہجہاں سے لے کر مغل حکمران اورنگ زیب تک اور ان کا مغل دربار کے ذریعہ جاری قاضی یا مفتی کے اعلیٰ عہدوں پر فائز ہونے کا یا اس کو اس خدمت کے صلہ میں جاگیرات کے ملنے کا سلسلہ سبب اور تاریخی ثبوت متذکرہ شخصیات سید محمد زماں خان دوراں اور انصاری خاندان کی بزرگ شخصیت ملا شیخ احمد المعروف ملاجیون کے ممتاز ناموں سے ظاہر ہوتا ہے۔ اور اس سے یہ بات بھی ظاہر ہو جاتی ہے کہ متذکرہ شخصیات اپنے علمی و دینی مرتبوں میں کتنی اہم اور خصوصی رہی ہیں، مغل دربار میں جن کی سفارش اور اثر و رسوخ نے ان اہل علم خاندانوں کو دینی خدمات انجام دینے کے لیے مواقع فراہم کیے اور وہ اپنے علم اور ذاتی اہلیت، صلاحیت اور خصوصیات کی وجہ سے زمانے کی نظروں میں احترام سے دیکھے جاتے

تھے۔ قاضی سید محمد صالح کے اس نسبتی خاندان سے متعلق رشتوں کے تذکرے کے درمیان ایک اہم اور خصوصی وضاحت بہت ضروری ہے۔ جس وقت قاضی سید محمد صالح محکمہ قضا کے عہدہ جلیلہ پر فائز تھے اسی علاقہ مالوہ میں علاقہ دوراہہ میں قاضی سراج الدین صاحب مغل حکمراں شاہجہاں کے دربار سے جاری حکم کے مطابق قاضی دوراہہ مقرر ہوئے، اس حکم کے مطابق انھیں جاگیر بھی دی گئی اور وہ اس وقت اس علاقہ کی معتبر اور ممتاز شخصیات میں شمار کئے جاتے تھے۔ سردار دوست محمد خاں جب اس علاقے میں داخل ہوئے تو ان کی تجربہ کار نظریں متذکرہ شخصیات پر ٹھہر گئیں اور سردار صاحب نے ان دونوں شخصیات سے رابطہ قائم کیا اور انتہائی عزت واحترام سے ان کو اپنے ساتھ رکھتے ہوئے ان کے مشوروں پر عمل کیا اور ان کا تعاون حاصل کیا۔ جیسا کہ قاضی وجدی الحسینی نے تحریر فرمایا ہے:

> ''ریاست بھوپال کی تشکیل میں اس علاقے کے قاضیوں کا خصوصی ہاتھ رہا ہے۔ سردار دوست محمد خان بانی ریاست کی ابتدائی قصبہ بیرسیہ کی مستاجری سے ہوئی جس کے اندر وہاں کے قاضی محمد صالح اور ریاست کی توسیع میں قاضی سراج الدین قاضی دوراہا کا خاصہ حصہ ہے۔
> (تاریخ ریاست بھوپال، وجدی الحسینی، ص:۹۰-۹۱)

ان میں قاضی سید محمد صالح اور اور قاضی محمد سراج الدین (دوراہہ) مالوہ کے اس علاقے میں معروف شخصیات میں سے تھے، جو اپنے دینی مرتبوں اور اپنے علم وفضل میں سربلند وممتاز تھے۔ دونوں شخصیات علاقہ مالوہ یعنی بیرسیہ اور دوراہہ جو مغل حکمرانوں کے زیر انتظام حکومت میں شامل تھا، اس کے سیاسی نقشہ پر بھی اپنا ایک جداگانہ اور مخصوص مقام قائم کئے ہوئے تھے۔ یہ وہ دور تھا جب کے مغل حکمراں شہنشاہ اورنگ زیب کی

وفات ۱۷۰۷ء میں ہو چکی تھی۔

ملک کے سیاسی نقشے پر نئی نئی فوجی طاقتوں نے اپنے پیر پھیلانا شروع کر دیئے تھے۔ ملک میں سیاسی بازیگر اپنی بازیگری کے نقشے تیار کرنے میں مصروف تھے۔ مغل حکمرانوں کی سرحدیں اور وسعتیں سمٹنا شروع ہو گئی تھیں۔ اس وقت سیاسی اعتبار سے ہندوستان میں کوئی نظم و نسق قائم نہ تھا۔ ہر طرف افراتفری، انتشار اور لوٹ مار کا بازار گرم تھا۔ مغل سلطنت اکبر اور اورنگ زیب کی سطوت اور جلال کے بعد ان کے کمزور جانشینوں کے ہاتھوں دم توڑ رہی تھی۔ ملک کے ماحول میں سخت بے چینی کی سی کیفیت طاری تھی۔ ایک طرف مرہٹوں کے بڑے بڑے فوجی گروہ تھے جو جنوب سے چل کر وسط ہند، شمال اور مشرق میں منظم مگر کمزور حکومتوں سے جنگ و جدال میں لگے ہوئے تھے۔ بڑی بڑی طاقتور ریاستیں، چھوٹی چھوٹی ریاستوں سے اپنی فوجی زور آزمائیوں میں معروف تھیں۔ چھوٹے چھوٹے فوجی گروہ اپنی فوجی طاقت کے بل پر ابھر کر سامنے آ رہے تھے۔ انھیں میں سردار امیر خاں (ٹونک کے پٹھان) جیسے، چھوٹی چھوٹی جمعیتوں کے مالک بھی طالع آزمائی میں اپنے اپنے علاقوں میں سرگرم تھے، جو اپنی حکومتیں بنا کر تاریخ کا نیا باب کھولنے کی جدوجہد میں معروف تھے۔ ایسے ہی قسمت آزماؤں میں ایک پٹھان سردار تھا۔ جو فوجی طاقت میں کمتر تھا مگر عزم و حوصلہ اور دلیری میں نہایت ہی ممتاز تھا، بیر سیہ سے ملحقہ ایک چھوٹے وسیع علاقہ اسلام نگر (شیام نگر) میں اپنا سیاسی مستقبل نصب کرنے میں کامیاب ہوا۔

سردار دوست محمد خاں جب بیر سیہ علاقہ میں داخل ہوئے تو انھوں نے اپنے حصول مقصد یعنی مستاجری حاصل کرنے کے لیے اس علاقے کی معروف شخصیات کی معلومات کی اور ان پر نظر ڈالی، سردار دوست محمد خاں کی نظریں قاضی سید محمد صالح پر ٹھہر گئیں۔

چونکہ اس وقت اس علاقے میں دینی، علمی، ادبی اور سیاسی رسوخ کے لحاظ سے ان کی شخصیت منفرد اور ممتاز تھی۔ انھوں نے قاضی سید محمد صالح سے رابطہ قائم کیا اور ان کا تعاون حاصل کرنے کی کوشش کی۔ جیسا کہ بھوپال کی تاریخ ''تاج الاقبال'' میں درج ہے کہ مستاجری حاصل کرنے کی تحریک میں سردار دوست محمد خاں کو تعاون قاضی سید محمد صالح، سبدل رائے، عالم چند کا حاصل رہا۔ اس طرح اس علاقے میں اس اولوالعزم، حوصلہ منداور دلیر شخصیت نے اپنے پیر جمائے جیسا کہ ڈاکٹر رضیہ حامد تحریر فرماتی ہیں:

''دوست محمد خاں اہل علم کی قدر و منزلت کرتے تھے، خود ان کو انشا پردازی اور فارسی ادب میں دستگاہ حاصل تھی۔ ان کے گرد و پیش اور دربار میں بڑے بڑے عالم اور قابل مسلمان اور ہندو موجود تھے۔ ان میں قاضی محمد معظم، قاضی سید محمد صالح، راجہ وجے رام دیوان مشہور تھے۔'' (نواب صدیق حسن خاں، ڈاکٹر رضیہ حامد، ص:۱۳۲)

محترمہ ڈاکٹر رضیہ حامد کی یہ تاریخی معلومات اور تحقیق قاضی سید محمد صالح صاحب کی شخصیت کے ان روشن پہلوؤں کو اجاگر کرتے ہیں جو ڈاکٹر سلیم حامد رضوی صاحب کی تحقیق پر لبیک کہتے نظر آتے ہیں۔

ڈاکٹر سلیم حامد رضوی صاحب کی دریافت اور تحقیق میں شامل اس علاقہ مالوہ میں مقام بیرسیہ کے شاعر قاضی سید محمد صالح ابن سید محمد مصلح امیٹھوی جن کے جدامجد شاہجہاں کے زمانے سے بیرسیہ کے عہدہ قضا پر فائز تھے اور یہ عہدہ جلیلہ قضاء ان کے خاندان میں نسلاً بعد نسلٍ اپنی پوری دینی عظمت اور دینی بزرگی کے ساتھ جاری رہا۔

سردار دوست محمد خاں کے بعد نوابین اور بیگمات بھوپال نے بھی اس قاضی خاندان کو اپنی عظمت اور دینی بزرگی کا اہل قرار دیتے ہوئے ریاست کے گذرے حکمرانوں کی پسند

اور دینی خدمات کو پیش نظر رکھتے ہوئے اپنے دور حکومت میں وہی عزت اور احترام دیا جو کہ وہ اپنی زندگیوں میں دیا کرتے تھے۔ قاضی سید محمد صالح کے نسلاً بعد نسلٍ خاندان کی اولادوں نے بھی اپنے آپ کو علم و فضل اور دینی تعلیمات کے اہل اور لائق بنائے رکھنے کی سعی اور سلسلہ جاری رکھا تا کہ اس دینی عہدہ جلیلہ کا کامل حق ادا کیا جا سکے اور اپنی دینی اور تعلیمی درس و تدریس کی ذمہ داریوں کو پوری طرح ادا کیا جا سکے۔ یہ مسلسل خدمات اس خاندان میں کم و بیش دوسو سال کے طویل عرصے پر محیط نظر آتی ہیں۔ اسی کے ساتھ اس خاندان کے افراد نے علمی وادبی وراثت کو بھی ساتھ ساتھ اپنی زندگیوں میں جاری و ساری رکھا۔ علم دینی اور عصری کو حاصل کرنا اپنا مقصد حیات بنائے رکھا۔

قاضی سید محمد صالح کی شخصیت خالصتاً علمی اور روحانی تھی۔ بنیادی طور پر آپ ایک جلیل القدر عالم تھے اور علم و فضل کے ساتھ ایک بڑے روحانی پیشوا اور ایک کامل شیخ طریقت بھی تھے۔ جن کے جذب سلوک کے فیض سے بیرسیہ اور اس کے اطراف میں پاکیزہ روحانی زندگی کی ایک اثر انگیز فضا پیدا ہوئی۔ جیسا کہ ڈاکٹر رضیہ حامد رقم طراز ہیں:

> ''بیرسیہ کے قاضی محمد صالح پیشوائے دین اور عربی، فارسی، ہندی اور اردو کے شاعر تھے۔ انھوں نے اردو میں 'مثنوی اخلاق' تصنیف کی، جس میں اسلامی اخلاق کو نظم کیا ہے، قاضی صاحب کی مثنوی خالص مذہبی رجحانات کی ترجمان ہے وہ شاعری کو محض مذہبی نظم کا درجہ قرار دیتے تھے۔'' (نواب صدیق حسن خاں، رضیہ حامد، ص:۱۳۲)

قاضی سید محمد صالح کے تخلیقی ذخیرے میں ڈاکٹر سلیم صاحب کو صرف ''مثنوی اخلاق'' ہی نہیں ملی بلکہ اور مثنویاں اور ادبی تحریریں بھی ملیں جو دیمک خوردہ حالت میں تھیں جو اس بات کی نشاندہی کرتی نظر آتی ہیں کہ قاضی صاحب مستقل اور مسلسل اس علمی عمل کو اپنی

زندگی میں جاری کئے ہوئے تھے۔ چونکہ وہ عربی، فارسی، ہندی، اردو زبانوں پر قدرت رکھتے تھے۔ قاضی صاحب کی ''مثنوی'' ۱۷۰۷ء کی وقتی پیداوار نہیں ہے بلکہ کم از کم دوسو سال کے ادبی ارتقاء کا نتیجہ ہے'' یہ وہی صاف اور سادہ زبان ہے جو ہمیں دلی میں پچاس سال کے بعد ملتی ہے۔'' قاضی صاحب کا موضوع احکام، عقائد اسلامی تعلیمات اور اخلاقیات پر ہے جس کو آسان، سہل اور تدریسی انداز میں نظم کیا گیا ہے اس میں وہی حلاوت اور نرمی پائی جاتی ہے جیسے کہ ایک مشفق معلم کے لہجے میں ہوتی ہے بقول ڈاکٹر سلیم صاحب.

''اس مثنوی کی ساری اہمیت اس کی قدامت میں ہے۔ دوسری اہم خصوصیت تسلسل ہے جو قاضی صاحب کے تجربہ یافتہ ذہن کا پتہ دیتی ہے'' (ص:۷۵)

ڈاکٹر صاحب نے اس مثنوی میں ۱۶۵، اشعار صحیح اور سلامت ظاہر کئے ہیں جس میں بقول ان کے:

''البتہ سو (۱۰۰) کے قریب ایسے اشعار ہیں جن کو دیمک زدہ ہونے کی وجہ سے پڑھا نہیں جاسکا'' (ص:۷۵)

طمع جس نے دل میں ہے کی بے شمار — تو ہووے گا بیشک وہ ذلت گذار
طمع کا شانہ جو آدم.....! — طمع جس میں آئی وہ غارت ہوا

دنیا کی خدمت میں بیشتر اشعار لکھے گئے ہیں۔ چنانچہ کہتے ہیں:

ہے دھوکہ یہ دنیا کا سب کاروبار — نہیں اس میں کچھ بھی ثبات و قرار
ہے کچھ آج اور کل تماشا ہے کچھ — کہوں کیا کہ اس کا سراپا ہے کچھ
طریقہ عجیب اس کا دکھا یہاں — کہ اس میں گرفتار رہیگا جہاں

نہ آسودہ اس میں ہوا ہے کوئی گرفتارِ خواری رہا ہر کوئی

گردشِ زمانہ اور اس کے فتنہ اور شر سے بچنے کی تعلیم دیتے ہوئے کہتے ہیں:

پھنساتا ہے چکر میں یہ آسمان ملاتا ہے آخر میں درخاک یاں

بچے تو جو اس سے، نہ ہو، ناتواں یہ سن رکھ مری بات تو اومیاں

خدا اس سے تجکو بچائے رکھے طرف اپنی تجکو جھکائے رکھے

رہیو تو گوشے میں بیٹھا جدا کیا کر ہمیشہ تو ذکر خدا

محبت ہے خالق کی گر دل کے بیچ تو غم کی نہ ہوے یہاں اونچ نیچ

(اردو ادب کی ترقی، ڈاکٹر سلیم حامد، ص:۷۶)

ڈاکٹر سلیم حامد رضوی نے اپنے تحقیقی مقالے میں قاضی سید محمد صالح کو علاقہ بھوپال کا پہلا دریافت شاعر ظاہر کیا ہے اور اپنے مقالے کے اول باب میں قاضی سید محمد صالح، قاضی معظم اور مفتی خیر اللہ صدیقی کے مختصر خاکے پیش کیے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب نے قاضی سید محمد صالح کی تحریر کی ہوئی ''مثنوی اخلاق'' کے ۱۶۵/اشعار کے اوراق کا مکمل حالت میں دریافت ہونا ظاہر کیا ہے۔ ان میں سے سو (۱۰۰) اوراق ایسے ہیں جو دیمک خوردہ ہیں اور جن کا پڑھا جانا مشکل رہا۔ پھر بھی ان اوراق میں سے ۶۵، اشعار جو پڑھے جا سکے تھے ان کو پیش نظر رکھ کر اپنے پہلے باب کی تکمیل کی ہے۔ لیکن اپنی کتاب میں انھوں نے قاضی صاحب کی دریافت ''مثنوی اخلاق'' کے صرف ۱۱/اشعار ہی درج کیے ہیں اگر سب کے سب ۶۵/اشعار شامل مقالہ ہوتے تو اس وقت کی ابتدائی اردو زبان کے اور الفاظ جو اس وقت رائج نہیں ہیں اور زبان کے ارتقائی عمل کے سبب متروک کیے جا چکے ہیں معلومات میں اضافہ کرتے ۔بہر صورت ڈاکٹر سلیم حامد رضوی صاحب کا یہ عظیم کارنامہ ہے جو اردو زبان و ادب کے

سنگ میل ہے۔ محققین کے لیے روشن راہوں کا کام انجام دے رہا ہے۔ ہاں ایک بات کا ظاہر کر دینا ضروری ہے کہ راقم السطور نے اس باب کی آخری شخصیت مفتی خیر اللہ صدیقی پر تحقیقی مقالہ ''اردو ادب کی ترقی میں مفتیانِ بھوپال کا حصہ'' جناب پروفیسر آفاق احمد صاحب کی زیرِ نگرانی تیار کیا جس کا دائرہ تحقیق بھی کم و بیش دو سال پر محیط ہے۔ برکت اللہ یونیورسٹی بھوپال سے ڈاکٹر آف فلاسفی (اردو) کی ڈگری حاصل کی ہے۔ متذکرہ تحریر کو لکھنے کا مقصد راقم السطور کا یہ ہے کہ اگر محققین کی نظریں اس طرف رجوع ہوں اور ان کے ذہن اس موضوع کی طرف رخ کریں تو قاضی سید محمد صالح پر تحقیقی انداز میں کام کرنے کی بہت کچھ گنجائش ہے۔ اور ڈاکٹر سلیم حامد رضوی صاحب تحقیق کے لیے روشن راہیں ان کے قدموں کو آگے لے جانے میں معین و مددگار بن سکتی ہیں۔ تاکہ ڈاکٹر سلیم صاحب کی محنت رائیگاں نہ جا سکے اور ہم اپنی تحقیقی عمل کا ایک نیا انداز پیش کر کے ادب میں اضافہ کر سکیں۔

☆☆☆

ڈاکٹر رضیہ حامد

نواب سلطان جہاں بیگم اور ان کا تعلیمی شغف

نواب سلطان جہاں بیگم ریاست بھوپال کی بیدار مغز، روشن خیال اور بالغ نظر حکمراں تھی۔ تعلیم کے فروغ کے لئے تاحیات کوشاں رہیں۔ انھوں نے اپنی صنف کے مسائل اور تعلیم و ترقی کی طرف توجہ دی۔ دسمبر ۱۹۲۰ء سے مئی ۱۹۳۰ء تک علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کی چانسلر رہیں۔

نواب سلطان جہاں بیگم جب تک کسی چیز کی ضرورت و اہمیت کو اچھی طرح ذاتی طور پر سمجھ نہ لیتی تھیں کوئی قدم نہیں اٹھاتی تھیں۔ نواب وقار الملک سے دو تین ملاقاتوں کے بعد ان کو علی گڑھ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کے بارے میں تفصیلی اور تسلی بخش معلومات حاصل ہوئیں۔ کالج کے فوائد اور حالات سے مطمئن ہونے کے بعد نواب سلطان جہاں بیگم نے اپنے جود و سخا کے دروازے کالج پر کھول دیئے۔ اپنے چھوٹے صاحبزادے نواب حمید اللہ خاں کو بغرض تعلیم علیگڑھ بھیجا اور پورے چھ سال تعلیم دلوائی۔ انھوں نے کالج کی قومی مرکزیت کو قائم رکھا۔ ایک غریب اور ایک شاہزادے نے ایک ہی کلاس میں بیٹھ کر تعلیم حاصل کی۔ علیگڑھ میں قائم آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی بھرپور مدد

کی اور اس کی بنیادوں کو مضبوط کر دیا۔ ایجوکیشنل کانفرنس کی عمارت کے لیے پہلے پندرہ ہزار روپیہ دینے کا وعدہ کیا، لیکن جب صاحبزادہ آفتاب احمد خاں نے بھوپال جا کر ان کو عمارت کے ضروری نقشے اور اخراجات بتاتے ہوئے عمارت کی ضرورت بیان کی تو کل تخمینہ پچاس ہزار روپیہ ادا کر دیئے۔ اس امداد میں ان کے صاحبزادوں اور بیگمات نے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

۵ر فروری ۱۹۱۶ء کو علیگڑھ میں آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی عمارت کا افتتاح کیا۔ یہ عمارت سلطان جہاں منزل کے نام سے مشہور ہے جو نواب سلطان جہاں بیگم کے نام سے منسوب کی گئی ہے۔

دسمبر ۱۹۱۰ء کی کانفرنس میں طے ہوا کہ مسلم یونیورسٹی کی تحریک کو قوم کے سامنے پیش کیا جائے تو پرنس آغا خان اور نواب وقار الملک الہ آباد پہنچے جہاں نواب سلطان جہاں بیگم گئی ہوئی تھیں۔ نواب سلطان جہاں بیگم نے ان کی پوری گفتگو بغور سننے کے بعد فرمایا:

''ایک لاکھ اس وقت دیتی ہوں مگر کہے دیتی ہوں کہ اور بھی دونگی، اس کے علاوہ میں نے خود دیکھا ہے کہ علیگڑھ میں ہماری قوم کے بچے گرمی میں سخت تکلیف برداشت کرتے ہیں۔ انھیں بجلی کی روشنی اور پنکھے بھی دونگی اور ریاست کے جاگیرداروں اور عمال سے بھی روپیہ دلواؤں گی۔ اگر ہز ہائینس نظام سے بھی ملاقات ہوگئی تو ان سے بھی مدد مانگوں گی۔''

ہز ہائینس آغا خان نے بھرائی آواز میں اپنے شکریہ کو ان الفاظ میں ادا کیا:

''دل بندہ را زندہ کردی، دل اسلام را زندہ کردی، دل قوم را زندہ کردی، خدا تعالیٰ بہ طفیل رسول اجرش بدہد۔'' !

(ترجمہ: بندے کا دل زندہ کر دیا، اسلام کو زندہ کر دیا۔ خدا تعالیٰ رسول اکرم ﷺ کے

طفیل آپ کو اجر عظیم دے۔)

اس کے بعد بھوپال میں جب چندہ کی وصولی شروع ہوئی تو نواب سلطان جہاں بیگم نے اس مہم کی حوصلہ افزائی کی اور عمائدین ریاست کو چندہ دینے کی ترغیب دی۔ خواتین میں تعلیم سے دلچسپی اور تحریک پیدا کرنے کے لئے پرنس آف ویلز لیڈیز کلب بھوپال میں ایک پرجوش تقریر کی وہاں موجود خواتین نے نہایت کشادہ دلی کے ساتھ اس چندہ میں شرکت کی۔

مارچ ۱۹۱۳ء میں لاہور کا سفر کیا جہاں مسلمان خواتین کی درخواست پر خواتین کے لئے مخصوص ایک ہال کا سنگ بنیاد رکھا اور پانچ ہزار روپیہ عطیہ میں دیا ۲ ہال نواب سلطان جہاں بیگم کے نام سے منسوب کیا گیا تھا۔

۱۹۱۳ء، ۱۹۱۴ء میں دارالعلوم دیوبند کے معاملات بد سے بدتر ہو گئے، اصلاح کی کوئی راہ نہ دیکھ کر نواب سلطان جہاں بیگم نے امداد بند کر دی اور جب اصلاح ہو گئی تو امداد بدستور جاری کر دی۔ روکی ہوئی رقوم بھی عطا کر دیں۔ محمڈن کالج علیگڑھ کے علاوہ دیوبند اور ندوہ کو بھی امداد دیتی تھی اور اپنی مرضی سے اضافہ کرتی رہتی تھیں۔

مولانا شبلی نعمانی کو، سیرۃ النبی، کے کل مصارف سے بے فکر کرنے والی نواب سلطان جہاں بیگم ہی تھیں۔ علامہ شبلی نعمانی ان کے اس فیاضی اور جوش و حوصلہ سے بہت متاثر ہوئے اور یہ قطعہ کہا۔

مصارف کی طرف سے مطمئن ہوں میں بہر صور
کہ ابر فیض سلطانِ جہاں بیگم زرافشاں ہے
رہی تالیف و تنقید روایت ہائے تاریخ
تو اس کے واسطے حاضر مرا دل ہے مری جاں ہے
غرض دو ہاتھ ہیں اس کام کے انجام میں شامل

کہ جس میں اک فقیر بے نوا ہے ایک سلطاں ہے [۳]

سیرۃ النبی، کی تکمیل کے بعد دوسرے کتب کی طباعت واشاعت کی دشواریوں کے پیش نظر تین ہزار روپیہ پریس مشین خریدنے کے لئے دارالمصنفین کو دیئے۔

انجمن ترقی اردو کو نواب سلطان جہاں بیگم نے نہ صرف یک مشت چار ہزار روپیہ کی امداد دی بلکہ ماہانہ امداد بھی جاری کی۔ مولوی عبدالحق جو اس وقت انجمن کے سکریٹری تھے ان کی درخواست پر انجمن کی کتاب ''ہمارا ملک'' میں ایک باب تعلیم نسواں کے متعلق تحریر کرنے کا وعدہ کیا [۴]

حالی میموریل اسکول پانی پت کے لئے خواجہ سجاد حسین بھوپال کی آمد پر نواب سلطان جہاں بیگم نے بارہ سو روپیہ سالانہ کی گرانٹ منظور کی۔ مکہ معظم میں مدرسہ صولتیہ کو امداد دی جاتی تھی۔

نواب سلطان جہاں بیگم نے ہندوستان کے تمام چیفس کالجوں کی اصلاح کا عزم کیا اور تجویز پیش کی کہ ایک یونیورسٹی قائم کر کے تمام چیفس کالجوں کے باہم اتحاد اور انتظام کا سنگ بنیاد رکھا جائے۔ نواب سلطان جہاں بیگم کی تجاویز سے امراورؤسا اور برٹش حکام و ماہرین تعلیم نے کافی حد تک اتفاق کیا، ان کی دماغی قابلیت، قوت فیصلہ اور تعلیمی شغف کا اعتراف کیا۔

تعلیم نسواں کی طرف نواب سلطان جہاں بیگم نے خصوصی توجہ دی۔ ریاست بھوپال میں لڑکیوں کے لئے کئی مدارس قائم کئے جن میں تعلیم کے ساتھ ایسی ٹریننگ بھی دی جاتی تھی کہ وہ عورتیں اور لڑکیاں جو معمولی گھروں سے تعلق رکھتی تھیں اپنی روزی گھر بیٹھے حاصل کر سکیں۔ ایک مدرسہ صنعت وحرفت بھی قائم کیا جو جاہل اور بے ہنر عورتوں کو محتاجی سے نکالنے کا سبب تھا۔ ریاست میں ایک نرسنگ اسکول قائم کیا ان کا کہنا تھا، ''دراصل

نرسنگ کی ہی تعلیم صحتِ انسانی کی کفیل ہوسکتی ہے۔''

نواب سلطان جہاں بیگم اصلاح کا کوئی موقع کبھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتی تھیں۔ خاص طور سے خواتین کے اخلاق کی اصلاح بہت ضروری سمجھتیں تھیں کہ اس پر قوم کے اخلاق کا دارومدار ہے۔ خواتین کی انجمنوں اور سوسائیٹیوں میں عید کے موقع پر، غرض جہاں موقع ہاتھ آتا اپنے مشن کو پورا کرتی تھیں۔ ایک موقع پر عورتوں سے خطاب کرتے ہوئے انھوں نے کہا:

''میں تعلیم کے ساتھ آزادی کو پسند نہیں کرتی جو اعتدال سے تجاوز ہوچکی ہے۔ ممکن ہے کہ یہ آزادی جو سرزمین یورپ میں ہے وہاں کے لئے مناسب ہو یا یہ آزادی مذہب عیسوی کی تلقین و ہدایت کے مطابق ہو۔ مگر ہندوستان اور بالخصوص مسلمانوں کے لئے کسی طرح اور کسی زمانہ میں، میرے خیال میں موزوں نہ ہوگی اور نہ خدا تعالیٰ کے احکام کبھی غیر مفید ہوسکتے ہیں۔ پس ہم کو اس مقولہ پر عمل کرنا چاہئے۔ "خذ ما صفا و دع ملکدر" اچھی چیزوں کو لے لو اور بری چیزوں کو چھوڑ دو۔'' ۵

نواب سلطان جہاں بیگم کی ہمدردیوں کے دائرہ اثر میں ہر طبقے کی عورتیں شامل تھیں۔ انھوں نے مہر کے متعلق بھی توجہ فرمائی۔ اسلام نے مہر کا حق خاص طور سے عورت کے لئے مقرر کیا ہے۔ جس کا ادا کرنا مردوں پر لازمی ہے۔ لوگ بڑی بڑی رقمیں مہر میں باندھنے لگے تھے جن کی ادائی گی ناممکن تھی۔ نواب سلطان جہاں بیگم نے محکمۂ قضاۃ کو متوجہ کیا کہ مہر معجّل جو ایک سنت نبویؐ ہے، باندھا جائے۔ وہ غیر معتدل آزادی کی حامی نہیں تھیں وہ عورتوں کو آزادی اور حقوق کی اس سطح پر لانا چاہتی تھیں جو مذہب اسلام نے ان کے لئے تجویز کی ہیں۔ وہ خود بھی پردے کی پابند تھیں۔ انھوں نے بڑے سے بڑے دربار، مجلس اور

کانفرنس میں برقع پہن کر شرکت کی اور اپنی علمی قابلیت، اعلیٰ فراست، اصابت رائے، تدبر و بیدار مغزی کا لوہا منوالیا۔ عورتوں سے خطاب کرتے ہوئے کہتی ہیں:

''مسلمان عورتوں کو کبھی اس آزادی سے زیادہ کی خواہش نہیں کرنی چاہئے جو مذہب اسلام نے ان کو عطا کی ہے اور وہ آزادی ایسی آزادی ہے جو عورت کو اپنے حقوق سے مستفید ہونے اور تمام خرابیوں سے محفوظ رہنے کا ذریعہ ہے۔ غرض تعلیم حاصل کرو اور پابند طریقۂ اسلام رہو۔ تاکہ تمہاری قوم کی ترقی اور تم کو ہر قسم کی کامیابیاں حاصل ہوں۔''[۶]

ریاست بھوپال میں نواب سلطان جہاں بیگم نے پرنس آف ویلزم کے نام سے ایک لیڈیز کلب قائم کیا، جس سے ان کا مقصد عورتوں کے ذہنوں کو کھولنا ان میں اصلاح و ترقی کے ساتھ ہی ان کے اخلاق کو جلا دینا تھا۔ وہ خود بھی اس کلب میں جاتیں اور تمام عورتوں سے شگفتہ مزاجی سے بات کرتی تھیں۔ ان کی دلچسپیوں کے اور مختلف کھیلوں کے متعلق ان سے گفتگو کرتی تھیں، انہوں نے کلب میں کیا امیر، کیا غریب سب کو سادہ لباس میں رہنا لازمی قرار دیا تھا۔ ۱۹۱۷ء میں لیڈیز کلب میں تقریر کرتے ہوئے نواب سلطان جہاں بیگم نے کلب اور سوسائٹیوں کی اہمیت و افادیت پر روشنی ڈالی اور ان کا اصل مقصد خواتین کے ذہن نشین کیا:

''خواتین۔ عمدہ سوسائٹی ہمیشہ انسانی اخلاق کو جلا دیتی ہے اور اگر اسی کے ساتھ تعلیم بھی ہو تو نور علی نور ہو جاتی ہے۔ میں خود محسوس کرتی ہوں کہ اس کلب نے آپ کے گروہ میں ایک عظیم تغیر پیدا کر دیا ہے.....اس بات کو کبھی نہیں بھولنا چاہئے کہ کلب اور سوسائٹیاں عموماً کسی اصلاح یا ترقی یا کسی اور عمدہ مقصد کے لئے قائم کی جاتی ہیں

اور وہ عموماً شریفانہ مقصد ہوتے ہیں..... اگر اس کو صرف سیر و تفریح کا ہی مقام قرار دے دیا جائے اور اس میں ہمدردانہ کاموں کے متعلق تبادلۂ خیالات نہ کیا جائے یا کوئی اور مقصد پیش نظر رکھا جائے تو تضییع اوقات کی جگہ ہوتی ہے۔'' ؎

محمڈن گرلس اسکول علیگڑھ کی طرف نواب سلطان جہاں بیگم کا متوجہ ہونا بہت ضروری تھا۔ انھوں نے خود مسئلہ نصاب پر غور کیا اور ایک خاکہ مرتب کر کے ماہرین تعلیم کے سامنے پیش کیا۔ اسکول کو گراں قدر عطیہ دیا جو اس کے استحکام کا باعث ہوا۔ نواب سلطان جہاں بیگم کی جود و سخا ملک و بیرون ملک ہر طرف جاری تھی۔

۵/دسمبر ۱۹۱۱ء کو دہلی میں آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے شعبۂ تعلیم نسواں کی صدارت نواب سلطان جہاں بیگم نے کی اور اپنے مرتبہ خاکۂ نصاب کو پیش کیا۔ اس جلسہ میں مسز سروجنی نائیڈو اور پنڈت سرلا دیوی چودھرانی نے بھی شرکت کی تھی۔ اس موقعے پر نواب سلطان جہاں بیگم نے ایک سادہ مسلمان خاتون کی طرح قومی مجمع سے اپیل کی اور اپنی صنف کی وکالت فرمائی۔

نواب سلطان جہاں بیگم نے ۲۷/فروری ۱۹۱۴ء کو علیگڑھ میں آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی عمارت کا سنگ بنیاد رکھا۔ ۲۸/فروری کو اسٹریچی ہال میں ٹرسٹیان محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کو خطاب کیا ان کی یہ تقریر اسٹریچی ہال میں ہوئی تقریروں میں اعلیٰ شمار کی جاتی ہے۔ یکم مارچ ۱۹۱۴ء کو انھوں نے علیگڑھ کے گرلس اسکول کا افتتاح کیا اور سلطانیہ بورڈنگ ہاؤس کا سنگ بنیاد رکھا۔ اسی روز مسلم لیڈیز کانفرنس کا ابتدائی اجلاس گرلس اسکول کی عمارت میں ہوا جس کی صدارت نواب سلطان جہاں بیگم نے کی۔ اپنے خطبۂ صدارت میں انھوں نے کہا:

''آج کے دن اس زمانہ کے مسلمانوں کی تاریخ میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا ہے۔ اور جب کبھی آئندہ زمانہ میں اس دور کی تاریخ لکھی جائے گی تو اس میں ہمارے جلسے کا انعقاد ایک روشن باب ہوگا'' ۸

نواب سلطان جہاں بیگم نے مسلم لیڈیز کانفرنس کے نظم ونسق کے لئے گیارہ سو روپیہ سالانہ کی گرانٹ دینا منظور کیا۔ نواب سلطان جہاں بیگم نے عورتوں کی تعلیم اور ان کے دیگر مسائل کے پیش نظر ایک ایسی انجمن کے قیام کی تجویز پیش کی جس میں ہندوستان کی ہر قوم کی عورتیں شریک ہو کر اپنی ترقی، تعلیم، حفظ صحت کے ذرائع اور دیگر مسائل پر باہم تبادلہ خیال اور غور وفکر کر سکیں۔ اس تجویز کی پرزور موافقت ہوئی کہیں کہیں مخالفت بھی ہوئی لیکن یہ تجویز روز بروز عملی شکل اختیار کرتی رہی اس کا نام ''آل انڈیا لیڈیز ایسوسی ایشن'' رکھا گیا جس کے تمام مصارف مستقلاً نواب سلطان جہاں بیگم کے ذمہ تھے اس کی پیٹرن لیڈی چمس فوڑ دتھیں۔

مارچ ۱۹۱۸ء کو اس کا ابتدائی جلسہ ایوان صدر منزل بھوپال میں منعقد ہوا جس میں ہندو، مسلم، عیسائی، پارسی اقوام کی خواتین اور یورپین لیڈیز نے شرکت کی۔ پہلے اجلاس کی صدارت سلطان جہاں بیگم نے کی انھوں نے خواتین کی ہمت افزائی کرتے ہوئے کہا:

''خواتین آپ سب قوت مشترکہ سے کام لے کر اس مقصد عظیم میں کامیابی حاصل کریں۔ ہم کو اپنی کمزوری اور ضعفِ تخلیق کا خیال نہ کرنا چاہئے کیوں کہ تاریخ شاہد ہے کہ انھیں ضعیف ہاتھوں نے دنیا میں بڑی بڑی مہمیں سر کیں ہیں۔'' ۹

۱۹۱۲ء میں اٹاوہ کی ایک کانفرنس میں ماہرین تعلیم نسواں یورپین لیڈیز کے سامنے نواب سلطان جہاں بیگم نے اپنی رائے کا اظہار کیا ۱۹۱۸ء میں خود ایک نصاب مدارس

نسواں کے لئے تیار کیا اور ہندوستان کے تمام ڈائریکٹر تعلیم اور دیگر اہل الرائے کے پاس بغرض تنقید بھیجا۔ مدرسہ دہلی کی شاخ تعلیم دائیاں، کلکتہ کا مدرسہ نسواں، آلہ آباد و لکھنؤ کے لیڈیز کلب، سداسیون بمبئی، لیڈی ہارڈنگ کالج دہلی جیسے دور افتادہ مدارس و کلب ان کے فیض سے مستفید ہوئے۔ اس وقت ہندوستان کے ہر شہر میں کوئی نہ کوئی مدرسہ نسواں ایسا ضرور تھا جس کو نواب سلطان جہاں بیگم امداد دیتی ہوں۔ انھوں نے خواتین، مصنفین اور مؤلفین کی ہمیشہ حوصلہ افزائی فرمائی۔ خواتین کے انسٹی ٹیوشنوں سے دلچسپی اور ان کی امداد نواب سلطان جہاں بیگم کا مدعائے زندگی تھا۔

خواتین کی حوصلہ افزائی کی غرض سے ان کی ہنرمندیوں اور دست کاریوں کو خوش اسلوبی سے عوام کے سامنے پیش کرنے کے لئے نواب سلطان جہاں بیگم نے بھوپال میں ''نمائش مصنوعات خواتین ہند'' کے نام سے ایک وسیع نمائش کی بنیاد ڈالی۔ اس نمائش میں خود اپنے ہاتھ سے چند چیزیں تیار کر کے شامل کرتی تھیں۔ گوالیار، جنجرہ، سلطان پور، نرسنگڑھ، دھار، اور گلبرگہ کی رانیاں و بیگمات بھی اس نمائش میں اپنی دست کاری کے نمونے بھیجتی تھیں۔

نواب سلطان جہاں بیگم کو تقریر و خطابت میں کمال حاصل تھا۔ ان کے اظہار خیال کا طرز، جملوں کی ترتیب اور الفاظ کی نشست، بلاغت و فصاحت سب ان مسائل اور موضوع کے شان کے مطابق ہوتے تھے جس پر آپ گفتگو کرتی تھیں۔ بڑے بڑے مجمع کو اپنی تقریر سے مسحور کر لیتی تھیں۔ علامہ شبلی نعمانی اپنے ایک مضمون میں رقم طراز ہیں:

> ''مجھ کو حکمرانان اسلام سے متعدد روساء و والیان ملک کی خدمت میں حاضر ہونے کا اتفاق ہوا ہے۔ ان سے گفتگو اور ہم کلامی کی بھی نوبت آئی ہے لیکن میں بغیر کسی قسم کی رواداری اور تملق کے یہ کہنے پر مجبور ہوں

کہ میں نے اس وقت تک کسی رئیس یا والئی ملک کو اس قدر وسیع المعلومات، خوش تقریر، فصیح البیان، نکتہ سنج اور دقیقہ نہیں دیکھا۔ وہ تقریر فرمارہی تھیں اور میں محوِ حیرت تھا کہ کیا دہلی اور لکھنؤ کی سرزمین کے علاوہ اور کسی ملک کا آدمی بھی ایسی شستہ اور فصیح اردو بولنے پر قادر ہوسکتا ہے؟ وہ مختلف علمی اور انتظامی امور پر گفتگو کرتی تھیں اور میں سوچتا تھا کہ مخدرات اور حجلہ نشین بھی اس قدر معلومات حاصل کرسکتی ہیں۔'' ۱۰

نواب سلطان جہاں بیگم نے اپنے وقت کے جید عالموں سے تعلیم حاصل کی تھی۔ اردو فارسی اور انگریزی زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ تصنیف و تالیف کا شوق تھا۔ آپ نے اپنی بے پناہ مصروفیات کے باوجود اردو زبان میں اکتالیس کتابیں تصنیف و تالیف کیں۔ نواب سلطان جہاں بیگم کو مذہبی، تمدنی اور علمی خدمات کا شوق تھا، ایک لگن تھی، دنیا کی پوری تاریخ میں ایسی مثال نہیں ملتی کی کسی خاتون فرمانروا نے حکومت کی ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ تصنیف و تالیف کا اتنا وسیع کام کیا ہو۔ نواب سلطان جہاں بیگم گوناگوں صفات کی حامل اور مجموعہ کمال خاتون تھیں۔ ان کی کتابوں میں سے چند کے نام یہ ہیں۔

تزک سلطانی، گوہر اقبال، حیات شاہجہانی، معشیت اور معاشرت، تربیت الاطفال، سبیل الجنان، باغ عجیب، اختر اقبال، حفظ صحت وغیرہ۔

نواب سلطان جہاں بیگم کی سب کتابیں شستہ اور دلنشیں پیرایہ میں حشو و زوائد سے پاک ہیں، انھوں نے خشک اور روکھے مضامین اس قدر دلچسپ انداز میں تحریر کئے ہیں کہ پڑھنے والے کی دلچسپی اور شوق قائم رہتا ہے۔ اپنے مقصد کی تکمیل کے لئے سلطان جہاں بیگم نے عربی و انگریزی تصانیف سے بھرپور استفادہ کیا اور اس کو بحسن و خوبی قاری تک پہنچایا ہے۔ دفتری کاغذات پر ان کی مختصر توقعات نہایت دلچسپ اور اخلاقی و ادبی حیثیت

سے ممتاز ہوتی تھیں۔

نواب سلطان جہاں بیگم ۱۹۰۰ء سے ۱۹۲۷ء تک بھوپال کی مطلق العنان حکمراں رہیں۔ اپنے دو جوان العمر صاحبزادوں کی بے وقت موت کے بعد عنان حکومت اپنے چھوٹے صاحبزادے نواب حمید اللہ خاں کے سپرد کردی، اس اولوالعزم خاتون نے حکومت سے دست بردار ہونے کے بعد بھی اپنے تعلیمی مشن کے فروغ اور اصلاح قوم سے منہ نہیں موڑا اور برابر کوشاں رہیں ۱۹۳۰ء کو اس مجسمہ فہم فراست نے اس جہان فانی کو خیر باد کہا۔ مولوی ضیاالدین صاحبؒ کے مزار کے پاس صوفیہ مسجد احمد آباد بھوپال میں مدفون ہوئیں۔

حواشی

۱۔ بیگمات بھوپال مصنفہ محمد امین زبیری:

۲۔ زمین جس پر سنگِ بنیاد رکھا گیا تھا فروخت کردی گئی اور ہنوز ہال صرف تخیل ہی تخیل رہا۔ بیگمات بھوپال حصہ دوم ص:۱۵۳

۳۔ حیات شبلی مصنفہ سید سلیمان ندوی: ص،۸۵

۴۔ بیگمات بھوپال حصہ مرتبہ محمد امین زبیری۔ ص،۹۵

۵۔ بیگمات بھوپال حصہ دوم مرتبہ محمد امین زبیری ص،۹۸

۶۔ بیگمات بھوپال حصہ دوم: ص،۸۴

۷۔ بیگمات بھوپال حصہ دوم: ص،۱۱۴

☆☆☆

عارف عزیز

ابوسعید بزمی کی صحافتی و قلمی خدمات

ہندوستان کی جنگ آزادی میں جن شخصیتوں نے انگریز حکمرانوں اور شخصی فرمانرواؤں کے خلاف تحریر و تقریر کے ذریعہ آواز اٹھائی اور قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں ان میں ایک اہم نام فرزندِ بھوپال ابوسعید بزمی کا ہے جو ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ، گہری سوجھ بوجھ کے مالک اور ہمہ گیر صلاحیتوں کے حامل تھے۔ سیاست ہی نہیں شاعری، افسانہ نگاری، تاریخ نویسی اور صحافت وہ شعبے ہیں جن میں ابوسعید بزمی نے جوہر دکھائے، خاص طور پر ایک صحافی کی حیثیت سے غیر منقسم ہندوستان میں انہوں نے اپنی جو شناخت قائم کی وہ تاریخ کا ایک اہم باب ہے۔

ابوسعید بزمی ۱۹۱۰ء میں بھوپال کے ایک معزز خاندان میں پیدا ہوئے، یہیں پرورش پائی، اس زمانے کے رواج کے مطابق بھوپال اور دیوبند میں مذہبی تعلیم حاصل کی، جس سے وہ مطمئن نہ ہوئے تو انگریزی تعلیم کی طرف متوجہ ہو گئے اور ۱۹۳۵ء میں پنجاب یونیورسٹی سے اعلیٰ اعزاز کے ساتھ ایم اے کی ڈگری حاصل کی نیز دو گولڈ میڈل کے مستحق

قرار پائے، بزمی صاحب کو بچپن ہی سے علم وادب سے خاص دلچسپی تھی، وہ طالب علمی کے زمانہ سے ہی انجمنوں کے پروگراموں میں حصہ لے کر تحریر وتقریر کی صلاحیتوں کا مظاہرہ کرتے رہے، پھر سیاسی میدان میں قدم رکھنے پر ہی یہ صلاحیتیں ان کے کام آئیں۔

ابوسعید بزمی نے سب سے پہلے ۱۹۳۶ء میں مولانا سعید اللہ خاں رزمی کے ساتھ مل کر بھوپال میں ''سوشل سروس لیگ'' تشکیل دی، اسی زمانہ میں ایک ہفت روزہ اخبار ''رہنما'' جاری کیا، جس کی موثر تحریروں اور جری تنقیدوں کو حکومت وقت برداشت نہ کرسکی، چند اشاعتوں کے بعد ضمانت طلب کرنے پر یہ اخبار بند ہوگیا، اس ہفت روزہ کے مضامین اور سیاسی تجزیے نہایت مدلل، فکر انگیز اور دلچسپ ہوتے تھے، نوابی حکومت اور انگریزی سرکار پر سخت تنقید کے ساتھ عوامی جذبات وآزادی کی تحریکات کی بھرپور نمائندگی ہوا کرتی تھی، اس لئے یہ اخبار جہاں گیا لوگ بزمی صاحب کے گرویدہ بن گئے، کوئی ایک سال بعد ۱۹۳۷ء میں بزمی صاحب کا نام ملک کی سطح پر اس وقت ابھرا جب سہ روزہ اخبار ''مدینہ'' بجنور میں انہوں نے چیف ایڈیٹر کا عہدہ سنبھالا، یہ وہی اخبار ہے، جس میں اپنے زمانے کے مشہور صحافی مولانا نصر اللہ خاں عزیز اور مولانا حامد الانصاری غازی کام کرچکے تھے، ''مدینہ'' اپنے دور کے صف اول کے اخبار میں شمار ہوتا تھا، لہذا اعلیٰ صلاحیت وقابلیت کے صحافیوں کی خدمات اس کے لئے حاصل کی جاتی تھیں بزمی صاحب اس زمانے کے ممتاز ایڈیٹروں میں سب سے کم عمر تھے، اپنے اندازِ فکر اور طرز بیان کی بنا پر مختصر وقت میں وہ پورے ملک میں نہ صرف متعارف ہوئے بلکہ قدر ومنزلت کی نظر سے دیکھے جانے لگے۔

بھوپال اس زمانے میں نوابی ریاست تھی یہاں کے حالات وفضا آزادیٔ تحریر وتقریر کے لئے سازگار نہیں تھے، ظلم وزیادتی اور ناانصافی کے خلاف آواز اٹھانا بھی جرم تھا،

سرکاری ملازمتوں میں خوشامدیوں اور نمک خواروں کا غلبہ تھا، اعلیٰ عہدے سے مقامی لوگ محروم تھے، حکومت واقتدار پر زیادہ تر بیرون ریاست کے لوگ قابض تھے، مقامی شہریوں کو چوتھے درجے کی ملازمتیں ملتی تھی۔ بڑی جدوجہد کے بعد کوئی تیسرے درجہ کی ملازمت تک پہونچتا تھا، اسی لئے بے روزگاری و بے چینی بڑھ رہی تھی، لہذا عوام کی پریشانیوں نے تحریک کی شکل اختیار کرلی، شروع میں تو ملکی اور غیر ملکی کے نام سے تحریکات چلتی رہیں، لیکن ۱۹۳۸ء تک بھوپال میں کوئی باقاعدہ سیاسی جماعت نہ بن سکی۔ ''مدینہ'' میں ضرور بزمی صاحب دوسری ریاستوں کے ساتھ بھوپال کی خبریں شائع کررہے تھے۔ جس کی وجہ سے یہاں اس اخبار کی مقبولیت میں غیر معمولی اضافہ ہوگیا تو ریاستی حکومت نے ''مدینہ'' کا داخلہ بند کردیا، تقریباً ایک سال تک یہ پابندی جاری رہی لیکن ''مدینہ'' پڑھنے والوں کے شوق کا یہ عالم تھا کہ وہ بھوپال ریاست کے باہر دوسرے مقامات سے ''مدینہ'' اخبار خفیہ طور پر منگواتے اور شوق سے پڑھتے تھے۔

بھوپال سے جانے کے بعد ابوسعید بزمی کا اپنے وطن کی سیاسی تحریکات سے تعلق قائم رہا، اسی کے نتیجہ میں انہوں نے ایک اندھیری رات میں بارہ بجے کے بعد ایک مسجد میں بیٹھ کر خان شاکر علی خاں اور مولانا طرزی مشرقی کے ساتھ مل کر بھوپال اسٹیٹ پیپلز کانفرنس (پرجامنڈل) کی بنیاد رکھی، بعد میں ریاست کے کارکنوں کی سہ روزہ کانفرنس کرکے اس کے قیام کا باقاعدہ اعلان کیا، اس کی صدارت کرکے پیپلز کانفرنس کے پہلے صدر منتخب ہوئے، یہی جماعت بعد ازاں کانگریس میں تبدیل ہوگئی، اس میں پنڈت چتر نارائن مالوی اور ماسٹر لال سنگھ بھی شامل ہوئے۔

فروری ۱۹۴۰ء میں بھوپال کی لیجسلیٹو کونسل کا الیکشن ہوا، جس میں برائے نام ہی عوامی نمائندگی ہوا کرتی تھی، پیپلز کانفرنس نے چند نشستوں پر الیکشن لڑنے کا فیصلہ

کیا اور بزمی صاحب پر زور ڈالا کہ وہ الیکشن میں امیدوار بنیں، بھوپال سے غیر حاضر رہنے کے باوجود عوامی تائید سے ابوسعید بزمی کونسل کے لئے منتخب ہو گئے۔

جب بزمی صاحب لیجسلیٹو کونسل کے اجلاس میں شرکت کے لئے بھوپال آئے تو اجلاس سے ایک دن قبل ان کو ڈیفینس آف انڈیا رولز کے تحت گرفتار کر لیا گیا اور عوامی احتجاج کے باوجود ان پمفلٹس پر مقدمہ چلایا گیا جو پہلے شائع ہوئے تھے، ساتھ ہی ایک درجن کے قریب دوسرے لیڈر بھی گرفتار کئے گئے، مذکورہ دونوں مقدمات میں ۲۱-۲۱ ماہ قیدِ سخت اور جرمانہ کی سزا سنا کر انہیں جیل بھیج دیا گیا، جن پمفلٹس کی اشاعت کی پاداش میں بزمی صاحب کو سزا ملی، ان میں سے ایک میں ''پیام نیاز'' کے زیرعنوان انہوں نے بھوپال کی انتظامیہ کو جانبدار قرار دیکر اس کی ناانصافی پر روشنی ڈالی اور یہ الزام عائد کیا کہ شخصی حکمراں اپنی ریاست میں پریس کو آزاد دیکھنا نہیں چاہتے، باہر سے چھپوا کر کچھ منگوایا جائے تو اسٹیشن پر ایکسائز عملہ اسے قابل اعتراض قرار دیکر ضبط کر لیتا ہے، تاہم ان حالات پر بھی ہم صبر کرتے رہے، مگر وائے بدنصیبی کہ حکومت اس پر بھی مطمئن نہ ہوئی، ہمارا قلم چھین لینے کے بعد اسے فکر ہوئی کہ زبان بھی کاٹ لی جائے اور اس کے لئے جنگ سے متعلق قانون کا سہارا لے کر زباں بندی کے احکام نافذ ہونے لگے۔ اسی طرح دوسرے پمفلٹ ''عرضِ نیاز'' میں ابوسعید بزمی نے ایک ایسی ریاست جس میں ہندوؤں کی اکثریت ہے اس میں اسلامی حکومت کے جواز کو چیلنج کرتے ہوئے سوال کیا کہ ''میں اور میرے ساتھیوں کے خلاف سب سے بڑا الزام یہ ہے کہ ہم ہندوؤں سے مل کر مسلم حکومت کو نقصان پہونچا رہے ہیں لیکن یہ کوئی ہمیں بتائے کہ یہ اسلامی یا مسلم حکومت کہاں ہے جسے ہم نقصان پہونچا رہے ہیں؟ اس پمفلٹ میں بزمی صاحب نے بھوپال میں ذمہ دار حکومت کے قیام کے لئے یہ شرط رکھی کہ اس کی تمام ذمہ داریاں اہل

بھوپال کے سپرد کی جائیں اور ان کی صلاحیتوں کو پھلنے پھولنے کا موقع دیا جائے، دوران گرفتاری ابوسعید بزمی نے اس وقت کے سرکاری ترجمان روزنامہ ''ندیم'' بھوپال کے ایڈیٹر محمود الحسن صدیقی کے خلاف ازالہ حیثیت عرفی کا مقدمہ دائر کر کے الزام لگایا کہ محمود الحسن صاحب کا تعلق کیونکہ مسلم لیگ سے ہے اور وہ خود یعنی ابوسعید بزمی اسٹیٹ پیپلز کانفرنس کے صدر ہیں، اس لئے ان کی گرفتاری پر ''ندیم'' نے یہ بے بنیاد خبر شائع کی کہ ابوسعید بزمی نے جنگ کے خلاف پمفلٹ شائع کئے ہیں اور اس طرح ان کی نیک نامی کو صدمہ پہونچایا، پولیس سپرنٹنڈنٹ نے بھی بزمی صاحب کے موقف کی تائید کی۔ بعد میں یہ مقدمہ غالباً مولانا طرزی مشرقی کے درمیان میں پڑنے پر ختم ہوا۔ بزمی صاحب اپنی سزا پوری کر کے جب جیل سے رہا ہوئے تو ۱۹۴۲ء کی ہندوستان چھوڑو تحریک کا آغاز ہو گیا تھا، انہوں نے اس تحریک میں سرگرم حصہ لیا، چند ماہ بعد وہ دوبارہ ''مدینہ'' کی ادارت سنبھالنے کے لئے بجنور پہونچے اور کچھ عرصہ کام کر کے ''زم زم'' لاہور کے ایڈیٹر بن گئے، بعد میں وہ روزنامہ ''شہباز'' لاہور اور ''احسان'' لاہور و کراچی کے چیف ایڈیٹر کی خدمات انجام دینے لگے، ''احسان'' کی ادارت کے زمانے میں ہی امریکہ گئے، جہاں اچانک حرکت قلب بند ہو جانے سے ستمبر ۱۹۵۲ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔

بزمی صاحب نے مئی ۱۹۵۰ء میں ہند-پاک ایڈیٹرس کانفرنس منعقدہ دہلی میں شرکت کی اور وہ پاکستان نیوز پیپر ایڈیٹرس کانفرنس کے جنرل سکریٹری بھی رہے، انہوں نے اپنی ذہانت، یادداشت اور مطالعہ کی بنیاد پر بھوپال سینٹرل جیل میں ''تاریخ انقلابات عالم'' کے نام سے ایک ضخیم کتاب تحریر کی۔ حالانکہ جیل میں کسی طرح کے لکھنے پڑھنے یا مواد میسر کرنے کی سہولت انہیں حاصل نہیں تھی۔ یہ کتاب دو جلدوں میں شائع ہوئی ہے، ''مولانا آزاد تنقید و تبصرہ'' بھی ان کی مشہور کتاب ہے ''زندگی کے جائزے'' ان کے

افسانوں کا مجموعہ ہے، ''مسلمان کیا کریں؟'' ان کی ایک اور فکر انگیز کتاب ہے، ابوسعید بزمی بلند پایہ ادیب، مشاق صحافی و مورخ ہونے کے ساتھ اعلیٰ پایہ کے مقرر بھی تھے، اخبارات کے اداریوں کے علاوہ دیگر موضوعات پر معیاری مضامین و مقالات رقم کرتے رہے جو ہندوستان کے مختلف رسائل و اخبار، بالخصوص ''نگار'' لکھنؤ، ''جامعہ'' دہلی، ''معارف'' اعظم گڑھ، ''تیج'' دہلی، ''ہمایوں'' لاہور وغیرہ میں شائع ہوئے، افسوس کہ آزادی کے اس متوالے سے بھوپال کی نئی نسل ناواقف ہے، اس شہر میں جہاں وہ پیدا ہوئے، پلے بڑھے قانون ساز اسمبلی کے ممبر بنے ان کے نام پر کوئی یادگار موجود نہیں ہے۔

☆☆☆

کوئی محرم نہیں ملت جہاں میں — مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں
قفس میں جی نہیں لگتا کسی طرح — لگادو آگ کوئی آشیاں میں
کوئی دن بوالہوس بھی شاد ہولیں — دھرا کیا ہے اشاراتِ نہاں میں
کہیں انجام آپہنچا وفا کا — گھلا جاتا ہوں اب کے امتحاں میں
نیا ہے، لیجیے جب نام اُس کا — بہت وسعت ہے میری داستاں میں
دلِ پُردرد سے کچھ کام لوں گا — اگر فرصت ملی مجھ کو جہاں میں

بہت جی خوش ہوا حالی سے مل کر
ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں

مولانا الطاف حسین حالی

سید ضیاء الحسن

قتیلؔ-باندہ کا ایک نمائندہ شاعر

سرزمین باندہ (بندیل کھنڈ) کو اگر چہ اردو ادب کے حوالہ سے لکھنؤ، دہلی تو کیا رام پور اور حیدر آباد جیسی شہرت بھی حاصل نہ ہو سکی لیکن نوابین و روؤسائے باندہ نے دوسرے فنکاروں کے علاوہ اردو کے مشہور ادباء و شعراء کی جو پذیرائی کی ہے وہ تاریخ باندہ کا ایک سنہرا باب ہے۔ نواب ذوالفقار علی بہادر (1849-1800) خود بھی شاعر تھے اور قدر دان علم و ادب و بہی خواہان ادباء و شعراء، انہی کے عہد میں مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ 1827 کلکتہ جاتے ہوئے باندہ میں نواب صاحب کے مہمان رہے اور ان کی عنایت و نوازشات سے مستفید ہوئے۔ سعادت یار خان رنگینؔ جو کئی زبانوں کے ماہر تھے، 1243ھ بھرت پور سے واپسی پر باندہ آئے اور نو سال تک نواب صاحب موصوف کے دربار سے وابستہ رہے۔ اس عہد میں یہاں جو اردو شاعری کا ماحول پیدا ہو گیا تھا وہ لکھنوی اسکول کا تابع تھا۔

منیرہ شکوہ آبادی تو باقاعدہ نواب ذوالفقار علی بہادر ثانی کے صاحب زادہ نواب علی بہادر ثانی کے اتالیق کی حیثیت سے ایک عرصہ تک باندہ میں مقیم رہے ان شعراء کے علاوہ

اس دور میں محمد یار خان یکتا، بیدلؔ اور کئی دیگر ادبی شخصیتیں باندہ کے ادبی منظر نامے پر نظر آئیں گی۔

نواب صاحب کے انتقال کے بعد باندہ کی علمی و ادبی فضا برقرار رہی بلکہ نواب صاحب کے صاحب زادہ نواب علی بہادر ثانی (۱۸۷۳-۱۸۳۵) نے اس علمی ماحول کو مزید بلندی عطا کی۔ موصوف خود بھی زود گو اور پر گو شاعر تھے۔

انگریزوں کی ریشہ دوانیوں اور جھوٹے الزامات کے نتیجہ میں موصوف کئی سال نظر بند بھی رہے بالآخر ۲۷/اگست ۱۸۷۳ء میں بنارس میں وفات پائی۔ منیرؔ شکوہ آبادی نے ان کے انتقال پر ایک تعزیتی قطعہ تحریر کیا جس کا مطلع ہے۔

نواب علی بہادر اے بحر کرم یوسف طلعت شجاع یکتا ہے

۱۹۴۷ء سے پہلے کے باندہ میں اردو فارسی کا دور دورہ تھا جس کا اندازہ اس دور کے ادبی ذوق رکھنے والے ادباء و شعراء کی طویل فہرست سے لگایا جا سکتا ہے۔ حضرت قابلؔ باندوی کے شاگرد شیو پرشاد برگؔ اور ہنرؔ باندوی وغیرہ کے نام اس سلسلے میں پیش کئے جا سکتے ہیں۔ قتیلؔ باندوی بھی اسی سلسلہ کی ایک اہم کڑی ہیں جنھوں نے اردو ادب کی نہ صرف خدمت کی بلکہ یہاں کے ادبی ماحول کو اپنی شاعری کے ذریعہ فروغ بخشا۔

قتیل کی جائے پیدائش باندہ ہے جہاں انہوں نے ایک رئیس گھرانے میں بقول خود ''سن ۱۹۱۸ء میں قدم عالم وجود و شہود میں رکھا'' ان کے والد الحاج مظہر علی صدیقی نے ان کا نام جلیل احمد صدیقی رکھا گھریلو مروجہ تعلیم انہوں نے سید محمد الیاس مغربی صاحب سے اور فارسی جناب حافظ بانکے صاحب سے حاصل کی اس کے بعد رسم زمانہ کے مطابق باندہ کے ہی گورنمنٹ کالج میں داخل ہوئے اور یہیں سے ہائی اسکول پاس کیا۔ صاف گوئی اور بے باکی قتیل کی فطرت تھی وہ اچھی صحت کے مالک

بھی تھے پہلی صفت تو ان کی شاعری میں کام آئی اور دوسری صفت کے نتیجے میں اپنے وقت کے ممتاز اور نمائندہ ہاکی اور فٹ بال کے کھلاڑیوں میں ان کا شمار ہوا۔ خوش قسمتی سے باندہ ہی میں انہیں سرکاری ملازمت مل گئی۔ اب زندگی کی گاڑی پرسکون انداز میں رواں دواں تھی۔

قتیل ابتدا سے ہی موزوں طبع تھے اور گھر کے اردو، عربی اور فارسی والے ادبی ماحول کے پروردہ، نتیجہ یہ ہوا کہ طالب علمی کے زمانہ میں جبکہ ان کی عمر محض پندرہ سال کی تھی انہوں نے شاعری شروع کردی، اپنی شاعری کے بارے میں وہ خود لکھتے ہیں:

> ''مجھے یاد نہیں میں نے پہلا شعر کب کہا تھا ہاں اتنا یاد ہے کہ اسکول میں یا اطراف و جوانب میں جو مشاعرے ہوتے تھے اس میں شرکت کرتا اور ہر شاعر کے شعر پر شعر کہہ کر اس کا مذاق اڑایا کرتا تھا۔ (پھر) مجھے شعر پسند آنے لگے اور میں بے ارادہ شعر کہنے لگا۔''

بہرحال انہوں نے قتیل تخلص اختیار کیا اور میدان شاعری میں اتر پڑے، لیکن ہمیں ان کی باقاعدہ شاعری کا آغاز ۱۹۳۴ء یا ۱۹۳۵ء سے ملتا ہے۔ ۱۹۴۷ء تک دس سال ہندوستان کی سیاسی تاریخ کے بڑے اتار چڑھاؤ، گومگو، کشمکش اور الجھن کے گذرے ہیں تاہم اس غیر یقینی ماحول میں بھی ان کا قلم چلتا رہا۔ انہوں نے خوب خوب لکھا۔ کئی بیاضوں، متفرق کاپیوں اور منتشر کاغذوں پر بکھری ہوئی ان کی قلمی کاوشوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ زود گو شاعر تھے۔ ان کے کلام کا اچھا خاصہ ذخیرہ ان کے صاحب زادے جناب عقیل ارشد صاحب کے پاس محفوظ ہے۔ ہم نے ان کی شاعری کو سمجھنے کے لئے اسے تین ادوار میں تقسیم کیا ہے:

پہلا دور (۱۹۳۵ء تا ۱۹۴۷ء) غزلیات اور قطعات کا دور۔

دوسرا دور (۱۹۴۸ء تا ۱۹۵۱ء) نظموں کا دور۔

تیسرا دور (۱۹۵۲ء تا آخر حیات) نظموں اور نعتیہ شاعری کا دور۔

دور اول:

اس دور میں ان کے زمانہ طالب علمی کی ابتدائی غزلیں بھی شامل ہیں۔ قتیل نے جس دور میں شاعری شروع کی اس زمانے میں روایتی شاعری کا جو نمونہ ان کے سامنے موجود تھا وہی ان کے لئے رہنما بنا اور انہوں نے اسی انداز کی شاعری کی..... حسرت موہانی کی مشہور غزل کے پس منظر میں قتیل کی یہ کوشش ملاحظہ ہو۔

سب پہ افشا تو نے ظالم راز پنہاں کر دیا — کیا تجھے کرنا تھا اور کیا چشم گریاں کر دیا
جان دی، دل کو اسیر زلف جاناں کر دیا — ہو سکا جو تیری خاطر، جان جاناں کر دیا
اشک خونیں کا ہوں میں کس طرح ممنون کرم — میرے دامن کو خدا رکھے گلستاں کر دیا
ظلم ڈھائے اس قدر ہم کو خدا یاد آ گیا — ان بتوں نے آج کافر کو مسلماں کر دیا
ضبط کر سکتا نہ تھا منصور جن کو اے قتیل — ہم نے ان اسرار کو اس دل میں پنہاں کر دیا

مذکورہ غزل موصوف نے اس وقت لکھی جب وہ درجہ ششم کے طالب علم تھے اب ذرا درجہ ہفتم کی ایک کاوش دیکھئے جو بہادر شاہ ظفر کی غزل کے انداز میں ہے۔

ہے داغ ایسا کون دل داغدار میں — جلتا ہے مثل شمع جو کنج مزار میں
کھاتا نہ ٹھوکریں میں کبھی کوئے یار میں — اے کاش دل جو ہوتا مرے اختیار میں
تصویر ان کی، ان کی تمنا، ہجوم یاس — سب کچھ ہے کیا نہیں ہے دل بیقرار میں
میں اور توبہ بادہ کشی سے غلط غلط — زاہد گناہ اور وہ فصل بہار میں
دوبارہ آ رہے ہیں وہ مقتل میں کس لئے — شاید ہے جان باقی کسی جاں نثار میں

آخر میں درجہ ہشتم اور نہم میں کہی گئی غزلوں کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

اس قدر ظلم روا مجھ پہ تو اے صیاد نہ کر
میں وہ بے بس ہوں جسے طرزِ فغاں یاد نہیں
کیسے بھولے ہیں وہ کس ناز سے کہتے ہیں قتیلؔ
ہاں! کہیں آپ کو دیکھا تو ہے پر یاد نہیں

☆

دل نہیں لال دل کے سینوں میں
سانپ پالے ہیں آستینوں میں
چاندنی رات ہو چمن ہو قتیلؔ
لطف مئے تب ہے مہ جبینوں میں

☆

میرے رونے پہ تم تو ہنستے تھے
اب تمہیں کیوں ہنسی نہیں آتی
کیسی سادہ غزل کہی ہے قتیلؔ
تم کو کچھ شاعری نہیں آتی

قتیل کی بیاض سے نقل شدہ ابتدائی دور کی مذکورہ غزلیں یا اشعار جو ابھی آپ نے ملاحظہ فرمائے ان کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انہوں نے بہت سنبھل سنبھل کر اشعار کہے ہیں لیکن جیسے جیسے وہ آگے بڑھتے گئے ان کی شاعری پر دبستان لکھنؤ کا اثر نمایاں ہوتا گیا، کیونکہ یہاں کے ماحول میں یہی رنگ جاری وساری تھا۔ بقول اختر باندوی:

"باندہ میں نوابی عہد سے ہی شعری فکر پر لکھنوی اسکول کا اثر رہا ہے چاہے اس کی وجہ یہ رہی ہو کہ یہ علاقہ لکھنؤ کے زیادہ نزدیک واقع ہوا ہے یا یہ وجہ رہی ہو کہ یہاں آنے والے اساتذہ خود لکھنؤ اسکول کے مقلدین میں سے تھے۔"

(زہر آگہی میں شامل مضمون "قتیل بھائی اور میں" سے ماخوذ)

بہرحال یہ اشعار ملاحظہ کیجئے۔

دل چرانا ہی تم کو آتا ہے
اور کچھ دل لگی نہیں آتی؟
لڑکپن چلا، آرہی ہے جوانی
چھلکنے لگیں سادگی کی ادائیں

جوانی کے دن بھی قیامت کے دن ہیں نہ کیوں ہر قدم پر قدم ڈگمگائیں
گولاکھ وہ دیتے ہیں مرے دل کو تسلی دل اور پریشان ہے معلوم نہیں کیوں
آپ ہی انصاف کیجئے، سوچئے دل میں ذرا اس طرح سے کوئی بھی دنیا میں ٹھکراتا ہے دل
سر شام نکلے ہو زلفیں سنوار ے یہی جی میں آتا ہے لے لوں بلائیں
میں لوں بلائیں شام ہے گیسو سنوارئیے اس حال میں تو سیر گلستاں نہ کیجئے
کس سے پردہ چاہئے کس سے نہ پردہ چاہیئے سامنے آؤ مگر اپنا پرایا دیکھ کر
میرے پہلو میں آکر وہ مجھے تسکین دیتے ہیں مگر میں کیا کروں دل کی پریشانی نہیں جاتی

ایک تو غزل گوئی اور وہ بھی زمانہ شباب کی جس میں "حکایت بایار گفتن" کے ممکنہ معانی پنہاں ہوں، بڑی اہم چیز ہے لیکن اس عمر کی غزل گوئی آسان نہیں، جس انداز کی غزلوں کا نمونہ ابھی آپ نے ملاحظہ کیا اس کے لئے سکون واطمینان، عیش وعشرت، فراوانی رزق اور ماحول ضروری تھا۔ اس وقت کے جن حالات میں قتیلؔ اپنی زندگی گذار رہے تھے وہ ہرگز اس قسم کی غزل گوئی کے لئے موزوں نہ تھی۔

دوردوم

تقسیم ہند کے بعد ملک میں جگہ جگہ نفرت اور تعصب کا بازار گرم ہوگیا، فرقہ وارانہ فسادات پھوٹ پڑے اور اس وقت برادران وطن نے بھائی چارہ، یکجہتی، اتحاد واتفاق کو بالائے طاق رکھ کر مسلمانوں پر ظلم وتشدد کے جو پہاڑ توڑے ان سے تنگ آکر ان بے چاروں کے قافلے جوق در جوق پاکستان ہجرت کرنے پر مجبور ہوئے۔ ان نہتے راہ گیروں کو درندہ صفت انسانوں نے راستے میں بھی نہیں بخشا اور ظلم و بربریت کے جو انسانیت سوز نمونے دکھائے، ان کے خون سے جو ہولی کھیلی وہ افسوسناک اور دردناک

ہی نہیں بلکہ عبرت انگیز ہیں۔ان واقعات کو شاعروں، ادیبوں اور مورخوں نے تاریخ کے صفحات میں محفوظ کر رکھا ہے ۔

کبھی فرصت سے پڑھ لینا عجب ہے داستاں میری

الغرض افراتفری، ہجرت، کشت وخون اور پرفتن ماحول کے باعث ان کی شاعری نے کروٹ لی، ان کی سوچ اور ان کے لہجہ کا رخ بدل گیا بس یہیں سے ان کی شاعری کے دوسرے دور کا آغاز ہوتا ہے جس میں غزل کے لکھنوی اسکول سے انحراف، بُعد اور بے تعلقی کے ساتھ ساتھ نظموں کا رجحان بھی ملتا ہے۔اس زمانہ میں انہوں نے غزلیں بہت کم کہی ہیں ان کی جگہ قطعات اور نظموں نے لے لی ہے۔ چونکہ ادب سماج کا آئینہ ہوتا ہے اس لئے اس عہد کی کیفیات کا عکس ان کے کلام میں گھر کر گیا۔غزل کی شاعری چونکہ رمزیہ شاعری ہے اس میں سب کچھ اشارات وکنایات میں کہا جاتا ہے۔قدیم شعراء کے دواوین اس کی زندہ مثال ہیں۔قتیلؔ نے بھی اشاروں اور کنایوں میں سب کچھ کہہ ڈالا، فسادات اور قتل وغارتگری کو ذہن میں رکھ کر یہ اشعار پڑھئے۔

مرگ انبوہ سے اک جشن ہے دنیا میں قتیلؔ
زندگی رنگ نہ بدلے تو قیامت آجائے

یہ کس وحشی نے سر کو پھوڑ کر جاں اپنی دیدی ہے
کہ جس کے خوں سے ہیں رنگیں قفس کی تیلیاں اب تک

سخت جانی اور بے بسی ملاحظہ ہو۔

موت آئے تو ہو ختم یہ قید غم ہستی پیمانہ جو بھر جائے تو خالی ہو صراحی

انسانوں کی درندگی کے پس منظر میں یہ شعر ملاحظہ ہو۔

فلک والوں کو اب تک آدم خاکی کی حسرت ہے
مگر افسوس یہ انساں کبھی انساں نہیں ہوتا

اس شعر میں تجاہل عارفانہ دیکھئے۔

کس سوگ میں ڈوبی ہے گھٹاؤں کی سیاہی کیوں ہچکیاں بھر بھر کے روتی ہے صراحی

اس ضمن میں چند دیگر اشعار بھی ملاحظہ ہوں

قتیلؔ خستہ کے زخم جگر ہنستے ہی رہتے ہیں
خزاں میں بھی کبھی اس کا چمن ویراں نہیں ہوتا

☆

قمر بے ساختہ ہنستا ہے تارے مسکراتے ہیں
شریک غم کوئی اپنا شب ہجراں نہیں ہوتا

☆

خوشی سے اب تو اے صیاد تیرے ساتھ چلتے ہیں
ذرا اتنی اجازت دے، طواف آشیاں کرلیں

☆

سازش سے باغباں کی آنکھیں دکھانہ ہم کو
ہم خود ہی پھونک دیں گے اے برق آشیانہ

اس وقت علامہ اقبالؔ اور حالیؔ کی نظموں نے ماحول کو گرما رکھا تھا، قتیلؔ بھی ان سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ باوجود غزل سے محبت، اس کے حسن، اسکے رنگ وروپ، اس کی زبان کی نرمی اور ایک گونہ تعلق کے اس سے فرار کی کیفیت پیدا ہوگئی، اس کا اظہار یوں کرتے ہیں۔

غزل درحقیقت بہت خوب لیکن یہ میری سرشت وشریعت نہیں ہے
مجھے عشق کرنے کی فرصت نہیں ہے

غزل کے یہ جذبات اور یہ ترنم یہ شبنم کے آنسو یہ گل کا تبسم
یہ دل اتنا نازک یہ شور تلاطم رجز سامنے ہو تو پھر کیسے بولے
یہ نازک بہت ہے زباں کیسے کھولے

مجھے آج خاموش رہنا نہیں ہے غزل کی روانی میں بہنا نہیں ہے
وہ سب کچھ کہوں گا جو کہنا نہیں ہے غزل کو ترنم کی چاہت نے مارا
اور شاعر کو اہل سیاست نے مارا

۱۹۴۷ء کے پر تعصب ماحول، تقسیم ہند کے ماقبل اور بالخصوص مابعد کے دلدوز واقعات نے انہیں جھنجھوڑ کر رکھ دیا اس وقت اگرچہ غزل سے بے تعلقی بہت شاق گذر رہی تھی لیکن انہوں نے بادل نخواستہ اسے برداشت کیا اور غزل کو محبوب مجسم تصور کرتے ہوئے ایک طویل نظم "الفراق" تحریر کی جو انھی جذبات کی عکاس ہے، ملاحظہ ہوں چند بند ۔

رخصت طلب ہے تجھ سے ترا شاعر حزیں جانم نثار، اے مری محبوب تر غزل
کرسی نشین محفل صد رنگ الفراق جان عزیز، اے مری بالغ نظر غزل
خستہ شکستہ تیرا سفینہ وہ نامراد میں نے کسی طرح سے کنارے لگا دیا

☆

ہے تیرے دست ناز میں میرا ہی ساز دل جاں سوز میں نے اپنا ترنم تجھے دیا
صحن چمن میں غنچۂ نورس مہک اٹھے وہ برق ریز میں نے تبسم تجھے دیا

☆

تیرا مقام بزم سخن میں بلند ہے محفل میں تجھکو بخشا ہے اعزاز وافتخار

تو پیکر جمیل، سراپا حسین ہے اے میری شاہزادیٔ زریں و زرنگار

☆

اہل ستم کلیجہ کو سنتے ہی تھام لیں ڈوبی ہوئی وہ دور میں آواز دے چکا
فرش زمیں کو عرش بریں سے ملا کے آج تخئیل کو تری پر پرواز دے چکا

☆

اب تو بتا کہ چاہتی ہے مجھ سے اور کیا سب کچھ ہے تیرے پاس وہ میرا دیا ہوا
وابستہ تیری ذات سے لاکھوں ہے جاں نثار محفل میں تیری میں نہ ہوا بھی تو کیا ہوا

☆

فی الحال آج تو میرے دامن کو چھوڑ دے عیش و طرب کے دن نہیں اب وقت اور ہے
سب وقت کے غلام ہیں یا وقت ہے غلام یہ مسئلہ عجیب، ابھی زیر غور ہے

☆

فرصت تجھے جو دیں تری رنگیں مزاجیاں بہتا ہوا غریب کا اب خون دیکھ لے
ہاتھوں سے چھٹ رہا ہے مرا دامن غزل اب کس طرف کو مڑتے ہیں مضمون دیکھ لے

☆

اب رخ کئے ہیں تیرے مخالف تری طرف ہشیار باش، دیکھ یہ ساعت ہی اور ہے
ارباب حل و عقد کے تیور ہی اور ہیں ہم سایہ ہم زباں کی سیاست ہی اور ہے

نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے اپنے قلم سے تلوار کا کام لینا شروع کر دیا اور میدان غزل چھوڑ کر نظم کی جولانگاہ میں قدم رکھا۔ قتیل اپنے مجموعہ نظم ''زہر آگہی'' میں اس کی وضاحت خود فرماتے ہیں۔

''غزل سیاسی، اقتصادی، اور معاشرتی زندگی سے کوئی تعلق نہ رکھتی تھی،

لفظوں کی بازیگری، رعایت لفظی اور معاملہ بندی کو حاصل کلام سمجھا جاتا تھا جو دل پر قطعی اثر نہ کرتی تھی اس لئے غزل اصلیت اور حقیقت سے خالی تھی۔ مبالغہ، صنعت گری کے جوہر دکھا رہا تھا۔ نظم کو غزل گو (حضرات) ''چٹکلا شاعری'' کہتے تھے..... یکا یک ہندوستان آزاد ہوا اور ملک میں نیا انقلاب آیا۔ انقلاب کے ساتھ اس ملک کے ادب پر بھی انقلاب آیا..... ناگاہ کئی حادثات کا شکار ہوا۔ مجبوری اور ناکامی کا شکار ہو کر قنوطیت میں ڈوب گیا..... پس میں نے غزل سے فرار اختیار کیا کیونکہ غزل اس عالم میں کوئی سنتا نہ تھا، وہ بے وقت کی راگنی بن کر رہ گئی تھی۔ ٹوٹی ہوئی کشتی پر ملہار گانا عقلمندی نہ تھی۔ میں رائج الوقت نظریات کی تائید نہ کر سکا۔ میرے مطالعہ میں حالی اور اقبال کی نظمیں تھیں۔ میں غزل سے منہ موڑ کر نظمیں کہنے لگا..... اس وقت میری فکر کا محور سیاست ایک متحرک ترقی پسند انقلاب انگیز آفاقی نظریۂ حیات بنا..... میرے ساتھ دو چار اور نظم گو شعراء میرے ہمنوا بنے۔ نظموں کا دور آیا۔ غزل کے ساتھ ساتھ عوام نظم سننے کے زیادہ مشتاق رہتے تھے۔''

(''زہر آگہی'' میں شامل قتیل باندوی کے ''عرض حال'' سے ماخوذ)

قتیل کا ذہن انقلابی تھا اور انقلابی شاعری کے لئے انہیں نظم سب زیادہ موزوں صنف سخن معلوم ہوئی۔ الغرض انہوں نے نظمیں لکھیں اور خوب خوب لکھیں ان کا مجموعہ ''زہر آگہی'' اسکا ثبوت ہے اور یہی وجہ ہے کہ انہیں ''رومانی، انقلابی شاعر'' یا ''تلوار اور قلم کے شاعر'' کے نام سے یاد کیا گیا۔

بحیثیت مجموعی قتیل کے کلام میں تنوع بھی ہے اور سادگی بھی، جدت بھی ہے اور روز مرہ کے تجربات بھی۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیے۔

جدت

اس طرح اب آپ بھی آکر رہیں دل کے قریب
جس طرح کشتی لگا کرتی ہے ساحل کے قریب
ہیں مسیحا اور فضا بالیں پہ دونوں ساتھ ساتھ
معرکہ آرائی ہے تقدیر اور تدبیر میں
غبار قافلہ سے کیوں صدا رہ رہ کے آتی ہے
بچھڑ کر رہ گیا ہے کیا شریک کارواں کوئی

سادگی

آگیا ہوں وہاں سے گھبرا کر اب کہیں دل بہل نہیں سکتا
کس طرح وہ عدم کو جائے گا دو قدم بھی جو چل نہیں سکتا
قتیل بے نوا ٹوٹا ہے تیرا ساز دل جب سے
کسی محفل میں تجھ سے اب غزل گائی نہیں جاتی

تجربہ

راز داروں سے بھول کر بھی قتیل راز کی بات کی نہیں جاتی
کلیسا میں صنم خانے میں کعبہ اور گرجا میں نہ دیکھا جلوۂ جاناں سے خالی آستاں کوئی
کیا اسی کا نام دنیا میں محبت ہے قتیل
اک خلش سی ہے جگر میں درد ہے دل کے قریب

دورسوم

نظمیں اور نعتیہ شاعری اس دور میں قتیلؔ نے نظموں کے ساتھ ساتھ نعت گوئی کی طرف توجہ کی اور نعتوں کو بھی نظم کے انداز میں تحریر کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ نعتیہ شاعری دوسری اصناف سخن کے مقابلے میں زیادہ مشکل صنف ہے کیونکہ وہ رسول معظم، نور مجسم اور رحمت عالم ﷺ کی ذات والاصفات سے تعلق رکھتی ہے، بلکہ یہی نعت کا اصل موضوع ہے اس دشوار گذار راستے سے بغیر کسی لغزش کے گذر جانا ہر فنکار کے بس کی بات نہیں۔ نعت رسول ﷺ بڑی نازک راہ ہے۔ ایمان کی پختگی، عقیدت کی گہرائی اور توفیق شعری پر مکمل اعتماد اور بھروسے کے بغیر نعت گوئی کا حق ادا نہیں ہوسکتا۔ زبان کی ذرا سی لکنت اور قلم کی ذرا سی لغزش شاعر کو کہیں سے کہیں پہنچا سکتی ہے۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ "باخدا دیوانہ باش و با محمد ہوشیار"۔

میرا خیال ہے قتیلؔ نے بہت احتیاط سے یہ دشوار گذار راہ طے کی ہے۔ دلوں کا حال صرف اللہ جانتا ہے اور وہی عفو و درگذر کرنے والا ہے۔ شاعر کی نیت صادق ہے اور خلوص دل سے وہ آقائے نامدار ﷺ کی خدمت میں گلہائے عقیدت پیش کرتا ہے۔

زمین و آسماں پر ہر جگہ جلوہ نما تم ہو
نہیں ہے دوسرا کوئی محمد مصطفےٰ تم ہو
ہمیں معلوم ہے جو کچھ، کچھ اس سے بھی سوا تم ہو
خدائے ہر دو عالم سے کوئی پوچھے کہ کیا تم ہو
بقا دونوں عالم کی سعادت ختم ہے تم پر

قتیلؔ سرکار ﷺ کی غلامی میں شامل ہونے کی تمنا یوں کرتے ہیں ملاحظہ کیجئے۔

پیش ہو محشر میں جب فرد غلامانِ رسول

لکھ لیا جاوے قتیلؔ باندوی کا نام بھی

اپنی عاجزی اور اعتراف گناہ کے ساتھ ساتھ رسول اکرم ﷺ سے وابستگی پر انھیں ناز بھی ہے۔

منم عاجز بہ صدق دل نبی اللہ می گویم
گنہگارم دلے نازم نجی اللہ می گویم

عام بے دینی اور مذہب سے بے تعلقی پر شاعر کڑھتا ہے اور کہتا ہے۔

کون ہے جز آپ کے ٹوٹے دلوں کا آسرا
اپنی رحمت سے ہوا کا رخ پلٹ دیجئے شہا

شاعر آپ ﷺ کو "قرار صبر و تسکین کہہ رہا ہے اور کہتا ہے کہ ساری کائنات میں صرف امت کی فلاح و بہبود کے لئے آپ ﷺ ہی بے چین و بیقرار رہتے تھے اور ہم غریبوں کے لئے "امتی امتی" کہہ کہہ کر راتیں گذار دیتے تھے۔

اے قرار صبر و تسکین، بے قراروں کے لئے
مانگنے والے دعائیں ہم غریبوں کے لئے

نعت گوئی میں نفس مضمون کا مسئلہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ عام طور سے مدینہ کی حاضری کی آرزو، درود و سلام، احسانات رسولؐ، وصف جمالؐ اور خلق مصطفےٰؐ وغیرہ ایسے موضوعات ہیں جنھیں شعراء کرام برابر قلم بند کرتے رہے ہیں۔ لیکن قتیلؔ نے ان عنوانات کے ساتھ ساتھ منقبت اور معراج کے سلسلہ میں بھی اچھی کوشش کی ہے۔ بالخصوص "شریک خلوت قوسین" کے عنوان سے مسدس کی شکل میں ایک طویل نظم تحریر کی ہے۔ جس میں ۵۱ بند ہیں۔ اس میں سفر کی جزئیات، منظر کشی اور اشارات صحیحہ کو خوبصورت انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ بحیثیت مجموعی یہ نظم قابل تعریف ہے۔ نظم مثنوی

کے انداز سے یوں شروع ہوتی ہے۔

لکھ اے قلم ادب سے صفات شہ امم
وہ فخر کائنات وہ زینت وہ عجم
مشتق خدا کے نور سے ہے موردِ کرم
جس کے قدم پہ جھک گئے دنیا کے ذی حشم
فخر ملک ہے، اشرف واقدم ہے یا نہیں
حقا کہ وہ بنائے دو عالم ہے یا نہیں

سفر معراج کی یہ منظر کشی ملاحظہ فرمایئے۔

اقصیٰ سے جب چلے وہ شہ آسماں جناب
جبریل اور سارے فرشتے تھے ہم رکاب
مرکب تھا بے مثال تو راکب بھی لاجواب
اڑ اڑ کے دور ہٹ گئے سب لکۂ سحاب
تھرا گئے جلال کرامت ظہور سے
درباں فلک کے ہٹ گئے رعب حضور سے

یہ نظم شاندار انداز سے اس بند پر اختتام پذیر ہوتی ہے۔

بس امتی خدا کی عنایت پہ پڑھ درود
مومن ہے تو، تو صاحب امت پہ پڑھ درود
اپنے رسول پاک کی عظمت پہ پڑھ درود
تو بھی قتیلؔ ان کی رسالت پہ پڑھ درود
کس کا گذر بتادے سر لامکاں ہوا

ایسا سفر نصیب کسی کو کہاں ہوا

اردو شاعری میں اگر کوئی صنف سخن معاشرے کے لئے مفید ثابت ہوسکتی ہے اور نفس کی تہذیب نیز کردار کی شائستگی کا درس دے سکتی ہے تو وہ سرکار دو عالم ﷺ کی سیرت مقدسہ ہے چونکہ نعت گوئی آپ کی ذات جمیل، درس حیات اور اخلاق حسنہ کا ایک خوبصورت عنوان ہے اس لئے کامیاب نعت گو اگر ایک طرف محبت وعقیدت کے پھول نچھاور کرتا ہے تو دوسری طرف انسانی معاشرے کے لئے ایک مثبت اور تعمیری خدمت بھی انجام دیتا ہے۔ آخر میں اگر ہم یہ کہیں تو غلط نہ ہوگا کہ۔

ایں سعادت بزور بازو نیست

تانہ بخشد خدائے بخشندہ

راقم سطور نے حتی الامکان کوشش کی ہے کہ طائرانہ ہی سہی قتیلؔ کی شاعری کے کچھ اہم گوشے ابھر کر سامنے آجائیں۔ واللہ اعلم میں کس حد تک کامیاب ہوسکا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کے کلام کا مزید تحقیقی جائزہ لیا جائے تاکہ ان کی شاعرانہ خوبیاں اور ادبی مقام منظر عام پر آسکے۔

☆☆☆

ڈاکٹر مرضیہ عارف

محترمہ طیبہ بی صاحبہ کی علمی و تعلیمی خدمات

دنیا میں پیدا ہونے والے ہر انسان کو اپنی تکمیل کے لئے دو چیزوں کا محتاج ہونا پڑتا ہے ایک مادی وسائل دوسرا ذہنی شعور۔ اس میں سے پہلی ضرورت کارخانۂ قدرت سے اور دوسری ضرورت کارخانۂ تعلیم سے پوری ہوتی ہے۔ جسمانی نشوونما سے گزر کر ذمہ دار انسان بننے کے لئے جو چیزیں مطلوب ہیں وہ خالقِ کائنات نے اس نظام دنیا میں بڑی مقدار میں پیدا کردی ہیں مگر وہ لوازمات جو انسان کی ذہنی ترقی و تربیت کے لئے ضروری ہیں ان کا انتظام قوم، سماج اور خاندان کو درس گاہوں کی صورت میں کرنا پڑتا ہے اور ان درس گاہوں کو قائم کرنے کا کام انجام دیتے ہیں وہ مخلص و دردمند انسان جو نفع و نقصان سے اوپر اُٹھ کر ان کو چلانا اور ترقی کی منازل سے ہم کنار کرنا اپنا مقصد زندگی بنا لیتے ہیں۔

ایسی ہی مثالی ہستیوں میں استادِ محترمہ طیبہ بی صاحبہ (خالہ جان) کا شمار ہوتا ہے جو اپنے نازک و حسین خدوخال کے باجود کسی مردِ مجاہد کی طرح نہایت اعلیٰ مقصد کے لئے

زندگی صرف کررہی ہیں۔

خالہ جان جن کا نام والی ریاست نواب سلطان جہاں بیگم نے رکھا تھا بھوپال کے ایک جانے مانے خاندان میں پیدا ہوئیں۔ اس خاندان مین علم تو تھا مگر اس کو دوسروں میں تقسیم کرنے کی کوئی فضا نہ تھی۔ اس علم کے لئے بھی لڑکیوں کو تعلیمی اداروں میں بھیجنا عام طور پر معیوب سمجھا جاتا تھا، رواج کے مطابق خالہ جان کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ مزید تعلیم کے لئے انہیں کسی کالج یا جامعہ میں داخل ہونے کا موقع نہ ملا لیکن ان کی فطری ذہانت، قابلیت اور علم سے رغبت نے انہیں قرآن و حدیث، ریاضی و اخلاقیات کے معیاری نکات سے نہ صرف آراستہ کیا بلکہ ان علوم کی ترویج و اشاعت کا انہیں ذریعہ بنادیا۔

یوں تو خالہ جان نے شادی کے بعد دہلی میں چار سال تک قیام کر کے طب کی باقاعدہ تعلیم اور ڈگری حاصل کی مگر کاتب تقدیر نے ان کے لئے ''طبیبہ نہیں معلمہ'' بننا لکھا تھا چنانچہ جو علم انہیں میسر آیا اس پر خود عمل کیا اور نونہالوں کو اس کے مطابق ڈھالنے میں اپنی ساری صلاحیتوں کو صرف کرتے ہوئے مدرسہ حیات العلوم نسواں دینیات کو ایک مثالی دینی درسگاہ بنادیا۔

بھوپال اور اس کے اطراف میں شاید ہی کوئی مسلم گھرانہ ہو جہاں خالہ جان کے مدرسہ کی کوئی فارغ لڑکی نہ مل جائے، ایسے بڑے کام ٹیم ورک، جماعتی اسپرٹ اور اداروں کے بل بوتے پر ہوتے رہے ہیں لیکن کسی دھان پان سی خاتون نے تنہا یہ کام کیا ہو ایسی مثال کم ملے گی، ظاہر ہے کہ اس میں ان کے خلوص اور قوم کے لئے کچھ کرنے کا جذبہ شامل رہا ہے جس کے تحت خالہ جان نے اپنی جوانی سے بڑھاپے تک کا لمبا عرصہ کوئی ۶۰ برس خونِ جگر سے ان پودوں کی آبیاری میں صرف کردیا جن کو مستقبل میں تناور

درخت بن کر پھلنا پھولنا تھا۔ خالہ جان کی مستقل یہی کوشش رہی کہ جو بچیاں مدرسہ میں خالی ہاتھ داخل ہوں وہ اپنے دل و دماغ کو علم کی روشنی سے منور کر کے یہاں سے جائیں، اخلاق کی تربیت پائیں اور ادب کو ہاتھ سے جانے نہ دیں، اسی جذبہ سے مدرسہ حیات العلوم کی بانی اور مہتمم ہوتے ہوئے عام معلمہ کی طرح وہ آج بھی تفسیر و حدیث کا خود درس دیتی ہیں۔ عمر کے آٹھویں دہے کو عبور کرنے کی وجہ سے ان کی پہلی جیسی صحت آج باقی نہیں رہی مختلف عارضوں کا شکار رہتی ہیں پھر بھی مدرسہ کا اہتمام اور درس و تدریس کے علاوہ خواتین میں ''اصلاح و تبلیغ'' کی محنت کے لئے وقت نکال لیتی ہیں۔ بیرونی علماء کی آمد پر مدرسہ میں خصوصی اجتماعات یا اتوار کو خواتین کا ہفتہ وار اجتماع منعقد کرا کے آج بھی انہیں بڑا سکون ملتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے خالہ جان کو اولاد سے محروم رکھا تو ہزاروں کی تعداد میں اولاد معنوی سے انہیں نواز دیا، آج ان کا خاندان، ان کا کنبہ بھوپال کے دُور دراز محلوں تک پھیلا ہوا ہے جو اٹھتے بیٹھتے ان کو دعائیں دیتا ہے۔

خالہ جان بڑے سلیقہ کی خاتون ہیں بے ترتیبی، بدنظمی، بے احتیاطی اور مراتب سے لاپرواہی کو نہ خود پسند کرتی ہیں نہ دوسروں سے اس کی خلاف ورزی انہیں گوارا ہے، ان کی شخصیت کو دیکھ کر مجھے۔

''ایک ایسے گاؤں کی یاد آجاتی ہے جہاں زندگی بسر کرنے کی ساری چیزیں موجود ہوتی ہیں اور دوسرے کی محتاجی نہیں ہوتی۔''

حقیقت میں خالہ جان نے اپنے آپ کو خود بنایا ہے آج وہ جس مقام پر ہیں اس میں مالکِ دو جہاں کی مہربانی کے ساتھ ساتھ ان کی اپنی محنت اور فراست کا بھی بڑا حصہ ہے۔ درس و تدریس کے علاوہ تصنیف و تالیف سے بھی خالہ جان کو شغف رہا ہے، تاریخ پر

ان کی کتاب ''تاریخ فرماں روایان بھوپال'' اپنے موضوع و مواد کی وجہ سے قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے۔ احادیث اور ماثور دعاؤں کے ان کے مجموعے بھی کافی مقبول ہوئے ہیں۔ ''تاریخ فرمانروایان بھوپال'' اگرچہ نصابی ضرورتوں سے لکھی گئی ہے مگر اس میں سابق ریاست بھوپال کا جائے وقوع، جغرافیائی خصوصیات، حکمرانوں کے احوال، خصوصیت سے بیگمات کے عہد زریں کو رقم کر کے ان کی دانش و بینش کو صفحۂ قرطاس پر اس طرح محفوظ کیا گیا ہے کہ اس دور کی جیتی جاگتی تصویر آنکھوں میں پھر جاتی ہے اور آج کے جمہوری حکمرانوں سے ان کا مقابلہ کیا جائے تو بڑا واضح فرق نظر آتا ہے۔

یہ خالہ جان کی عقلمندی، معاملہ فہمی اور لیاقت ہی کہی جائے گی کہ انہوں نے ''مدرسہ حیات العلوم'' کو زمانہ کے حوادث سے بچائے رکھا اور اس کی ترقی و تعمیر میں مصروف رہیں۔ اوقاف شاہی سے پہلے انہیں موتی مسجد کا ایک حصہ مل گیا تھا بعد میں ایک بڑا قطعہ آراضی نواب پٹودی کی خصوصی توجہ سے فراہم ہوا جس پر اپنے تمام جمع شدہ اثاثے اور مخیر حضرات کے تعاون سے خالہ جان نے مدرسہ کی کشادہ عمارت کھڑی کر دی ان کے ایسے ہی چھوٹے بڑے کاموں کی فہرست اتنی طویل ہے کہ اس پر ایک کتاب لکھی جا سکتی ہے۔

بھوپال میں اردو زبان اور اس کی تعلیم کا چلن باقی رکھنے میں خالہ جان اور ان کے اسکول کا بہت بڑا ہاتھ ہے اگر محترمہ صبیح اختر جی صاحبہ مرحوم کے ''دارالحسنات'' میں اردو کی ابتدائی تعلیم اور ''حیات العلوم'' میں ابتداء سے اعلیٰ درجات تک اردو کی مستقل تعلیم نہ دی جاتی تو لڑکیوں میں بھی اردو پڑھنے کا سلسلہ کبھی کا ختم ہو گیا ہوتا۔ خالہ جان نے طالبات کو پرائیویٹ طور پر، پرائمری، مڈل اور ہائی اسکول وغیرہ کے امتحانات دلا کر شہر کے گرلز کالجوں سے یونیورسٹی تک اردو، عربی اور فارسی شعبوں کی رونق قائم کر رکھی ہے،

ان شعبوں کا اگر سروے کیا جائے تو ہر تیسری طالبہ دینی مدرسہ کی فارغ ملے گی۔ اردو کے لئے خالہ جان کی اس خدمت کا عام طور پر اعتراف نہیں ہوتا۔ لیکن تعلیمی میدان میں کام کرنے والے جانتے ہیں کہ آج خالہ جان کی شاگرد اور تربیت یافتہ لڑکیاں درس و تدریس سے صحافت تک اور پروفیسری سے ڈاکٹری و حکمت تک مختلف شعبوں میں کارہائے نمایاں انجام دے رہی ہیں۔ خالہ جان کی اس داستان جاں فشانی اور خدمت کو کوئی کیسے رقم کرے، عقیدت کا ایک شعر شاید اس کا اظہار کر سکے۔

کبھی شاخ طوبیٰ جو دیکھ لوں کہے شوق اس کو قلم کروں
سرنامہ فرطِ نشاط سے تیرا نام اُس سے رقم کروں

☆☆☆

سورج بھی خوش ہو دھوپ کا دل بھی دُکھا نہ ہو — ممکن ہے جب! درخت کا سایا گھنا نہ ہو
اپنے ہی سر پہ خاک اُڑائے جنون میں — پاگل کچھ اس قدر بھی سمے کی ہوا نہ ہو
دریا ہوں میں دُعا کا نہ لوں گا کہیں پناہ — چلتا رہوں گا چاہے کوئی راستہ نہ ہو
آندھی میں لی ہے تو نے یہ جس پیڑ کی پناہ — دشمن وہی مُبادا تری جان کا نہ ہو
یوں زندگی گزار کہ حیراں ہو جسم بھی — اس طرح سانس لے کہ ہوا کو پتا نہ ہو
خود ہی نکالو اپنا کوئی راستہ فراقؔ — ممکن ہے کل تمہارا کوئی رہ نما نہ ہو

فراقؔ جلالپوری

ذکیہ ظفر

افسانہ

''بس ایک کمرہ''

وہ مہینہ بھی پورا گزر گیا تھا۔ رضیہ نے مالک مکان کے گھر کی چوکھٹ گھس ڈالی تھی، لیکن اس کے صبح وشام کبھی پورے نہیں ہوئے تھے۔

بس کچھ مہینوں کے لئے ہی سہی....آپ....مہربانی کر کے....! اور مکان مالک کو آخر اس.....اور پھر اس کی خوشی کا ٹھکانہ نہیں رہا تھا۔!

اس وقت وہ اپنے باپ کے لمبے چوڑے جسم کو.....جواب نام ہی کو زندہ تھا، اپنے ہی کندھوں پر اٹھائے اس طرح اس بوسیدہ مکان کے نئے کمرے کی اونچی اونچی سیڑھیاں چڑھ رہی تھی جیسے کسی معصوم بچے کو اٹھائے ہوئے ہو۔!

آج اس میں اتنی طاقت۔؟ رشتوں کی جواب دہی کا جنون تھا شاید وہ۔! ہمیشہ سے ہی گھر کے بزرگوں نے چھوٹوں کے ساتھ بڑی بڑی قربانیاں دیں پشتہا پشت سے یہ ہوتا رہا ہے لیکن بدلتی قدروں میں دوسری پیڑھی وقت اور حالات کے بڑھنے کے ساتھ پیچھے رہ گئی۔!

اس طرح کے کمرے کی تلاش میں رضیہ کو تین سال لگ گئے تھے۔

کیا وہ بھی یہ یقین کر لے۔، کہ اس کے باپ کے جسم میں جان نہیں ہے اور وہ ایک

مردہ جیسے جسم کو کندھے پر ڈالے سیڑھیاں چڑھ رہی تھی... یا یہ کہ وہ کچھ لمحوں کے لئے سکتہ میں ہیں اور جلدی ہی آنکھیں کھول دینگے...شاید ابھی کھولیں...!

یہ خیال آتے ہی رضیہ کے بدن میں ایک پھریری سی آئی اور اس نے ان کے لٹکے ہوئے ہاتھوں کی حرارت کو محسوس کرنا چاہا........ ہاں وہ گرم تھے......

ڈاکٹر نے کہا تھا کہ وہ اسی حالت میں رہیں گے یعنی ''کوما'' (بے ہوشی) میں رہیں گے۔ لیکن کسی بھی دن اچانک ہوش میں آجائیں تو وہ ایک معجزہ ہوگا۔ اس لئے پتلی خوراک نلکی سے دینے کے ساتھ بہت سے بہت نگرانی کرنا ہوگی۔

رضیہ اور زیادہ تیز اور مضبوط قدموں سے سیڑھیاں چڑھنے لگی تھی۔ اس کا ذہن اُن کی زندگی کو بچانے کے لئے تانے بانے بُن رہا تھا۔ لیکن کیا وہ وقت کو پکڑ سکے گی۔

اپنے باپ کی اتنی بری حالت کے باوجود وہ کیوں ان کو زندہ رکھنے پر تلی ہوئی ہے کیا وہ ان کی اس حالت کی ذمہ دار خود کو ٹھہرا رہی تھی....یا گناہوں کے بوجھ کا احساس اس کے نااہل ہونے کے ثبوت، اس کے ضمیر کو جھنجھوڑ رہے تھے، کہ وہ وقت پر اپنے فرائض پورے نہیں کرسکی ——— اور اب وہ اپنے باپ کے لئے لمبی زندگی کی دعائیں کررہی ہے۔

وہ دوسری منزل کے اس کمرہ میں پہنچ چکی تھی، جہاں اس کے ساتھ رہ کر وہ ان کی اچھی طرح خدمت کرسکے، وہ کمرہ میں تازہ ہوا اور سورج کی شعاعیں دیکھنا چاہتی تھی۔ اسی تلاش میں وقت اس کے ہاتھوں سے نکلتا چلا گیا تھا۔ وہ گزرے ہوئے لمحوں کی بے بسی کو ایک ایک کمی کو پورا کرے گی جو اسے اس کے باپ سے دور لے گئی تھی۔

اس نے آہستہ سے اپنے باپ کو پلنگ پر لٹا دیا اور ان کے وجود پر ایک ٹھہری ہوئی نظر ڈالی.....! ان کے ڈیل ڈول کو دیکھ کر ایسا گمان ہو رہا تھا جیسے وہاں ایک تندرست انسان سو رہا تھا.....کاش یہ آنکھیں کھل جائیں.....پلکوں کی جھالر سے ڈھکی بڑی بڑی

آنکھیں بہت خوبصورت لگ رہی تھیں۔اے خدا ان پلکوں کو جنبش دے دے۔دعا کے لئے اس کے ہاتھ اُٹھ گئے عجیب کیفیت سے وہ دوچار تھی۔اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔

رضیہ نے کمرے کی کھڑکیوں کو کھولا.... کمرہ کے کونے کونے میں سورج کی شعاعیں پہنچ گئیں تھیں۔۔وہ سوچنے لگی.....! کاش! یہ سورج رات کو بھی نکل سکتا جس سے وہ ان دنوں کی کمی کو پورا کرسکتی۔ جب اس کے باپ نے بغیر دھوپ اور تازہ ہوا کے اس اندھیرے کمرے میں دن گزارے تھے، جہاں وہ بالکل رہنا نہیں چاہتے تھے۔خیر کچھ بھی ہو اب وہ اس کے باپ سے ایک پل بھی جدا نہیں ہوگی چاہے اسے اس کا گھر بار ہی کیوں نہ چھوڑنا پڑے.....! وہ خوش تھی کہ وہ کمرہ اسے مل گیا تھا۔

لیکن کیا وہ ——— بچ سکیں گے ———!

یہ خیال آتے ہی وہ کھڑکی سے ہٹ کر اپنے باپ کے پلنگ کے پاس آکر کرسی پر بیٹھ گئی ———!''میں نے دیکھا ہے۔اسّی اسّی سال کے بوڑھوں کو سائیکل چلا کر اپنے کام خود کرتے ہوئے۔لیکن انھیں اتنی جلدی کیا ہوگیا۔'' وہ اپنے دل میں بدبدائی۔اتنی کمزوری کے باوجود وہ اپنے باپ کے پُرکشش چہرے پر گلابی لکیریں دیکھ رہی تھی۔ان کے ہاتھوں کی انگلیاں اور پیر تو ابھی بھی بہت خوبصورت تھے۔اس کا دل چاہا کہ وہ انھیں چھوئے اور وہ جھٹ سے ان کے بستر پر بیٹھ گئی۔پاجامے کے پائنچوں میں سے ان کے پیروں کی لمبی لمبی انگلیاں بہت اچھی لگ رہی تھیں، سنا تھا دادا اور دادی انھیں بچپن میں چندا کہہ کر پکارتے تھے۔وہ خود کو روک نہیں سکی اور ہاتھوں سے ان کے پیروں کو دھیرے دھیرے دبانے لگی۔وہ جب بھی ویسے ہی بے حس وحرکت تھے۔لیکن جب وہ ان کے پیروں کو دباتی، تو دباؤ سے خون انگلیوں کے ناخنوں میں آجاتا.....اور جب دباؤ کو ڈھیلا کرتی تو وہ خون پیروں کی سفید کھال میں واپس چلا جاتا۔ایڑیوں کو دبانے سے بھی یہ ہی

کیفیت ہوئی۔ ایک لطیف احساس کے ساتھ زندگی کی رمق بھی اسے ان میں نظر آرہی تھی.... کیا یہ پیر بے جان ہو سکتے ہیں؟ جس جسم میں اتنا خون ہو، کیا وہ مر سکتا ہے۔ ڈاکٹر کہتے ہیں یہ اسی حالت میں رہیں گے.......... کبھی بھی ہوش آسکتا ہے.... یا پھر اسی طرح لیٹے لیٹے..... نہیں نہیں اس نے اپنے خیالات کو جھٹک دیا.. اور ان کے چہرے پر نگاہیں جمادیں..... وہ بے خبر تھے زندگی اور موت کی کشمکش سے...... رضیہ نے ان کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لیا اور سینے پر سر رکھ کر دل کی دھڑکنیں سننے لگی—— سانسیں چل رہی تھیں، زندگی اپنی پوری روانی کے ساتھ بہہ رہی تھی۔ رضیہ سوچنے لگی—— تین سال پہلے جب وہ اس کے پاس علاج کرانے کے لئے آکر رہے تھے تب بالکل تندرست تھے اور رخصت ہوتے وقت بہت روئے تھے، مایوس ہو کر کہا تھا کہ "بیٹا.....! جگہ کی قلت کے باوجود تو نے میری اتنی اچھی دیکھ ریکھ کی ہے" اب اور کون کرے گا اس طرح دیکھ بھال مجھ بیمار کی.....!

وہ ہمیشہ بیٹیوں کو بھی بیٹا کہہ کر پکارتے تھے۔

آج تین سال بعد رضیہ پھیلی ہوئی دھوپ سے بھرے اس کشادہ کمرے میں سارا دن بیٹھی رہی۔

شام سرمئی ہوگئی تھی سورج غروب ہو چلا تھا کھڑکی میں سے دکھ رہے بڑے بڑے درختوں کے پتے خاموش ہو گئے تھے..... رضیہ اپنے باپ کی آخری سانسیں گن رہی تھی۔ یا بچی ہوئی سانسوں کی طوالت کی دُعا کر رہی تھی کہ نہ جانے کون سی سانس ان کی آنکھیں کھول دے—— ! اور وہ اپنے آپ کو معاف کر سکے۔

☆☆☆

پیشکش: اجمل فاروق ندوی

ادبی وثقافتی خبریں

اگنو کا فارسی زبان میں سرٹیفکٹ کورس کرانے کا فیصلہ

اندرا گاندھی اوپن یونیورسٹی (IGNOU) نے فیصلہ کیا ہے کہ وہ اب فارسی زبان کے سرٹیفکٹ کورسز کا بھی آغاز کرے گی۔ اگنو کے وائس چانسلر پروفیسر آر۔ایس پلائی نے بتایا کہ ''موجودہ دور میں فارسی زبان کافی اہمیت اختیار کرتی جارہی ہے اور اس زبان میں مزید تحقیق اور ترقی کی ضرورت ہے۔ ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ اپنے ہاں فی الحال سرٹیفکٹ کورسز کا آغاز کردیں۔ مستقبل میں ہم اس کورس کو پی۔ایچ ڈی تک لے جائیں گے۔ ہم نے بہت پہلے یہ کام کرنے کا ارادہ کیا تھا لیکن کسی کا ساتھ نہ ملنے کی وجہ سے یہ کام پورا نہیں ہو پارہا تھا۔ اب ایران کلچرل ہاؤس نے ہمیں اس سلسلے میں اپنے مکمل تعاون کی یقین دہانی کرائی ہے تو ہم بھی اس سلسلے میں پیش قدمی کررہے ہیں۔'' کیونکہ اندرا گاندھی اوپن یونیورسٹی اور ایران کلچرل ہاؤس کے اس معاہدے سے فارسی زبان و ادب کی ترقی اور ایرانی تہذیب وثقافت کو سمجھنے میں مدد ملنے کی امید ہے اس لیے اس معاہدے کو علمی حلقوں میں پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا جارہا ہے۔

مرکز الامام ابی الحسن الندوی میں میڈیا اور سماج کے موضوع پر سمینار

رائے بریلی کے معروف تحقیقی و تصنیفی ادارے ''دار عرفات'' کے مرکز الامام ابی الحسن الندوی میں ''میڈیا اور سماج'' کے موضوع پر ۳؍جنوری ۲۰۰۹ء کو ایک اہم سمینار منعقد کیا گیا۔ اس سمینار کی صدارت آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے صدر اور ندوۃ العلماء کے ناظم اعلیٰ مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی نے انجام دی۔ اپنے صدارتی خطاب میں مولانا نے کہا کہ ''ٹیلی ویژن جو میڈیا کا سب سے طاقت ور ذریعہ بن گیا ہے، اس میں اپنے مقاصد اور خواہشات کے لئے ایسی چیزیں بڑھا چڑھا کر پیش کی جارہی ہیں جن سے انسان سازی کا کام بری طرح متاثر ہو رہا ہے۔'' سمینار کے مہمان خصوصی مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی (ایڈیٹر البعث الاسلامی) نے اپنے خطاب میں موجودہ میڈیا کی خامیوں کا ذکر کیا اور اس بات پر زور دیا کہ میڈیا کو صحیح راستے پر لانے کے لئے صحیح فکر کے حامل افراد سامنے آئیں۔ ندوۃ العلماء لکھنؤ کے معتمد تعلیمات مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی نے اپنی تقریر میں عالمی میڈیا کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے میڈیا پر یہودی لابی کے قابض ہونے کی وجوہ اور اثرات پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے اس صورت حال پر تشویش کا بھی اظہار کیا۔ میڈیا کے موضوع پر برصغیر کی مشہور و معروف تصنیف ''مغربی میڈیا اور اس کے اثرات'' کے مصنف مولانا نذر الحفیظ ندوی نے بھی سمینار میں شرکت کی اور اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ''میڈیا کے مضر اثرات کی تلافی ان تمام وسائل کے ذریعہ کرنی چاہئے جو ہمارے اختیار میں ہیں۔ ہمارے رسائل اور مجلات کے علاوہ ایک بڑا وسیلہ جمعہ کے خطبے بھی ہیں۔''

یونیورسٹیوں میں مولانا آزاد بینچ کا قیام جلد

یونیورسٹی گرانٹس کمشن (UGC) نے آزاد ہندوستان کے پہلے وزیر تعلیم امام الہند

مولانا ابوالکلام آزاد کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے ان کے نام سے ملک کی چھ اہم یونیورسٹیوں میں بینچوں کے قیام کا فیصلہ کیا ہے۔ یونیورسٹیوں میں قائم یہ بینچ صحافت، ادب، اعلیٰ تعلیم، مذہبی مطالعہ، سیکولرزم اور مخلوط تعلیم جیسے موضوعات پر ریسرچ کرائے گا۔ خود مولانا آزاد کی جدوجہد آزادی، علمی خدمات اور تصنیفی کام بھی اس مطالعے میں شامل ہوں گے۔ یو جی سی کے چیئرمین پروفیسر سکھدیو تھوراٹ نے بتایا کہ ''مولانا آزاد کثیر جہتی صلاحیتوں کے مالک تھے۔ انھوں نے مختلف میدانوں میں اعلیٰ خدمات انجام دی ہیں۔ یہ بینچ ریسرچ کے ذریعے نئی نسل کو مولانا کی خدمات سے واقف کرائے گی۔''

کٹیہار میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے کیمپس کا قیام

کٹیہار صوبۂ بہار کا ایک کثیر مسلم آبادی والا ضلع ہے۔ ساتھ ہی وہاں مسلم معاشرہ تعلیم نہ ہونے کی وجہ سے بے انتہاء پسماندگی کا شکار ہے۔ لیکن اب حکومت ہند کے اس فیصلے کے بعد کہ کٹیہار میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا کیمپس قائم کردیا جائے، وہاں کے علمی حلقوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی ہے۔ لوگوں کو امید ہے کہ اس اہم اقدام سے بہار کی تعلیمی رفتار میں اضافہ ہوگا۔ حکومت بہار کے سابق وزیر اور اردو کونسل ہند کے صدر شمائل نبی نے کہا کہ اے۔ ایم۔ یو کے کیمپس کے قیام سے بہار کے طلباء و طالبات کو اعلیٰ تعلیم کے لئے ریاست سے باہر نہیں جانا پڑے گا اور غریب مسلم طلباء و طالبات بھی تعلیم سے محروم نہیں رہیں گے۔ اردو کونسل کے زیر اہتمام منعقد ایک نشست میں علیگڑھ یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر میجر بلبیر سنگھ، پٹنہ یونیورسٹی کے سابق پراکٹر پروفیسر عبدالسمیع، عربی و فارسی یونیورسٹی کے پرووائس چانسلر پروفیسر خالد مرزا اور سابق صدر شعبۂ اردو مگدھ یونیورسٹی، پروفیسر علیم اللہ حالی نے اپنے خیالات کا اظہار کیا اور اس کیمپس کے قیام پر اپنی خوشی اور امید کا اظہار کیا۔

يوسف محمد الندوي

الإعجاز الصوتي في القرآن الكريم

كلمة عجز معناها اللغوي: نقيض الحزم، و عدم القدرة، التعجيز هو التثبيط و مصدر "أعجز" هو الإعجاز و منه اشتقت لفظة معجزة و هي واحدة معجزات الأنبياء التي تؤيد نبوة الأنبياء.

ماوردت في القرآن الكريم لفظة "إعجاز" أو "معجزة" كما لم يستعملها المؤلفون قديما، بل استعملوا مكانها "آية" أو "كرامة" حتى جاء الواسطي واختار "إعجاز القرآن" عنوانا لكتابه المعروف، منذ ذلك شاع استعماله.

قد أفادت كلمة المعجزة دلالات جديدة، حتى عرفها علماء الكلام بأنها أمر خارق للعادة مقرون بالتحدي، سالم من المعارضة.

لاينحصر إعجاز القرآن في ألفاظه و تراكيبه و فصاحته اللغوية و بلاغتهِ المعنوية وروعاته البيانية فحسب، بل هو يتوسع إلى

محتوياته و علومه و معارفه، و إلى غيبياته و حقائقه الأبدية، وإلى تعليماته الدينية والخلقية والاجتماعية والمدنية، وإلى تأثيراته و إشاراته و نبؤاته وأ خباره۔

نرى في القرآن المجيد إعجازا عجيباً في تناوله من خلق الإنسان و الأكوان و النبات والأشجار والطيور والأسماك و الحشرات و الحيوان، إ عجازا علميا، و إ عجازا غيبيا، و إعجازا تشريعيا، و إ عجازا اقتصاديا، وإعجازا وقائيا، و إعجازا طبيا، و إعجازا أدبيا و فنيا۔

نزول القرآن:

نزل القرآن في زمان بلغت اللغة العربية فيه إلى مكانة عالية منذ نشأت حتى شبت و ترعرعت، و أصبحت في عنفوان شبابها عملاقا معطاء، و استظهر العرب شعرها و حكمها و أمثالها، وطاوعهم البيان في أساليب ساحرة حقيقة و مجازاً،إيجازاً وإطنابا، حديثا ومقالا، وهذا الزمان عصر ازدهار اللغة العربية و ارتقائها فصاحةً و بلاغةً و ذوقاً أدبياً، حتى كانت الروعة البيانية و الملكة الأدبية هي العاملة الوحيدة للتفاخر و التفاضل بين العرب في ذلك الزمان۔

الإ عجازالبياني:

أما الإعجاز البياني في القرآن الكريم فهو الذى تحدى به القرآن الإنس و الجن قاطبة منذ نزوله، و لا يزال إلى هذا اليوم الذي نحن نعيش فيه، أولا تحدى بالقرآن كله، ثانيا بعشر منه وبعد ذلك

بسورة حيث نقرأها:

۱۔ "فلياتوا بحديث مثله إن كانوا صادقين۔"

۲۔ "أم يقولون افتراه، قل فأتوا بعشر سور مثله مفتريات، و ادعوا من إستطعتم من دون الله إن كنتم صادقين۔"

۳۔ "وإن كنتم في ريب مما نزلنا على عبدنا فأتوا بسورة من مثله، وادعوا شهداءكم من دون الله إن كنتم صادقين۔"

۴۔ "قل: لئن اجتمعت الإنس و الجن على أن يأتوا بمثل هذا القرآن لا يأتون بمثلهِ، ولو كان بعضهم لبعض ظهيرا۔

كان للقرآن تأثير عجيب في النفوس الإنسانية منذ لحظة نزوله الأولى الذي هو لايزال يستمر إلى زماننا الذي هو عصر النهضة العلمية والتقنية،أثر القرآن الكريم في نفوس المؤمنين والمنكرين في آن واحد، إذاكنا نرجع إلى التاريخ نجد أصقاع اللغة العربيةو علمائها يخرون سجدا أمام إعجاز القرآن البياني وتأثيره البلاغي سواء من شرح الله صدره للإ سلام و من أدبر واستكبر۔

نرى من العرب القدامى ممن آتاه الله موهبة شعرية وقوة أدبية صنفين: إحداهما أصحاب قلوب صافية يسمعون القرآن و يتلونه و يتأثرون به و ينقطعون إليه حتى لا نرى منهم من يقول الشعر إلا قليلا، مثل حسان بن ثابتؓ، و عبد الله بن رواحةؓ، و كعب بن زهيرؓ و وليد بن ربيعة، كما أنهم اكتفوا الشعر متحيرين ببلاغة القرآن، قال بعض منهم لماذا أقول الشعر و القرآن أمامي، و قيل: إن القرآن

جمد شعر عبد الله بن رواحة۔

وثانيهما من الذي سمع القرآن وتأثر به تأثيرا بليغا ثم أدبر و استكبر كأمية بن خلف الذي سمع القرآن مع المسلمين، و سجد معهم بتأثيره البليغ دون وعي منه، ووليد بن المغيرة الذي سمع القرآن ورق له قلبه فجاء ه أبوجهل فوعده بالمال و السلطنة، فطلب منه قولا قبيحا يكره به القريش سماع القرآن، فقال: "فوالله مافيكم رجل أعلم بالشعر مني لابرجزه و لابقصيده ولابأشعار الجن، و الله مايشبه الذى يقوله شيئا من هذا، و والله إن لقوله لحلاوة، و إن عليه لطلاوة و إنه لمثمر أعلاه، مغدق أسفله و إنه ليعلو و مايعلى، و إنه ليحطم ماتحته، ثم يقول ماهو إلا سحر يوثر"، إن هذه المقالة اعتراف منه بتأثره البليغ بإعجاز القرآن الكريم وبقوته البيانية۔

موسيقية القرآن

لكل حرف من الحروف طنين و غنين و لكل كلمة من الكلمات جرس و ظلال يتذوقها الإنسان الذي يملك ذوقا فنيا و مواهب أدبية، يتذوق بها الموسيقى الفنية من كلمات جميلة، و لكل تعبيرات رشيقة تكون الموسيقى الداخلية و الموسيقى الخارجية۔

والذي أريد بالموسيقى القرآنية إيقاعات صوتية تؤثر في قلوب السامعين أو القارئين عند تلاوة القرآن، وهي تنبعث من تألف الحروف في الكلمات و تناسق الألفاظ في الفاصلة الواحدة إن في

القرآن إيقاعات موسيقية متعددة الأنواع، و هي تتناسق مع الجو ويؤدي وظيفة أساسية في البيان، تتكون الموسيقى القرآنية في نظم خاص منفرد من الشعرالفني و النثر الفني، وهي تعتمد على انسجام الحروف و الكلمات، و نغماتهماوطنينهما، و القرآن الكريم يجمع مزايا هامة كلها من الشعر الفني و النثر الفني، رغم ذلك قد أطلق التعبير من قيود القافية الموحدة والتفعيلات التامة، فنال بذلك حرية التعبير۔

ينطلق سامع القرآن أوقارئها فيكلماته و آياته فيغاية من الجمال الفني والذوق الأدبي يجدهما في نظامه الصوتيالبديع و في جرس حروفه الدوي بينما ينطلق في حركاته و سكناته و مداته و غناته و فصوله و وصوله فلاتمل الكلمات القرآنية آذان السامعين كما لاتكره ألسنة القارئين، يتذوق قارئ القرآن أو سامعه نوعين من الموسيقى لكلمات القرآن: الموسيقى الداخلية و الموسيقى الخارجية۔

يقول الأستاد السيد محمد الرابع الندوي -حفظه الله-عن هذه الناحية في كتابه "تاريخ الأدب العربي": "و من جمال عبارة القرآن هي رعايته الأثر الصوتي الذي تتركه الكلمة على نفس المخاطب، فإنه يراعي في ذلك أيضا الجو النفسي والوجداني للمخاطب فيكثير من الأحيان، فتؤثر الكلمة على نهن المخاطب بشكلهاومبناها نفس التأثير الذي يؤثربه معنى الكلمة"، يأتي الأستاد الندوي بنماذج

عديدة منها كلمة اثاقلتم، و دمدم، و يتفطرن وغيرها۔

الموسيقى الداخلية لكلمات القرآن:

الموسيقى الداخلية تكمن في الألفاظ و ائتلافها، و توالي الحروف و مخارجها، فتؤثرجوا موسيقيا يهز مشاعرنا ويطرب ألبابنا دون أن نستطيع تفسير هذا الجو أو شرحه أو تعليله۔ إنما ندركه بأذواقنا ونستشعر بإحساسنا لأن الموسيقى لاتعتمد على قاعدة، ولاتستمد إيقاعها من قانون نحن نستطيع أن نحس عذوبة الألفاظ ورقتها، وسحر إيقاعها وجمال موسيقاها، ولكن لانستطيع أن نعرضها ظاهرة۔

نورد هنا بعض الأمثلة للموسيقي الداخلية من القرآن الكريم۔

۱۔ (يا أيها الذين آمنوا مالكم إذا قيل لكم انفروا في سبيل الله اثاقلتم إلى الأرض، أرضيتم بالحياة الدنيا من الآخرة؟ فما متاع الحياة الدنيا في الآخرة إلا قليل۔)

يقول الأستاذ سيد قطب رحمه الله عن الموسيقى الداخلية لبعض كلمات هذه الآية: تسمع الأذن كلمة" اثاقلتم" في الآيات الكريمة فيتصور الخيال ذلك الجسم المتثاقل، يرفعه الرافعون في جهد فيسقط من أيديهم في ثقل، إن فى هذه الكلمة (طنا) على الأقل من الأثقال! و لوأنك قلت: تثاقلتم لخف الجرس، ولضاع الأثر المنشود، ولتوارت الصورة المطلوبة التي رسمها هذا اللفظ و استقل

برسمها۔

۲۔ (إذا زلزلت الأرض زلزالها)۔ و كذلك كلمة "زلزل" في الآية الكريمة حينما يتلفظ الإنسان بلسانه كلمة "زلزل" يخيل في ذهنه مدلولاته، لأن جرسها وإيقاعها يؤثر حركة شديدة وقلقا عنيفا في النفوس۔

۳۔ (النازعات غرقا، والناشطات نشطا)

الموسيقى الداخلية في الآيتين السابقتين توحي المخاطب ماتتناول الآيتان، أما الآية الأولى فتقول عن قبض الأرواح من الذين كفروا حيث أنهم يعانون مشاق شديدة حينما تأخذ الملائكة أرواحهم بالصعوبة و الخشونة، إن هذه الصعوبة والخشونة يجد القارئ أو السامع عند تلفظ الآية أو يسمعها حينما يقرأ "والنازعات" يوحي تلفظ حرف "ع" أن هذا القبض يكون من أعماق عروقه و عضلاته بأن مخرج 'ع' يكون من تحت الحلق، و الكلمة الثانية (غرقا) أيضا توحي الصعوبة والخشونة عند التلفظ كأنما يحس المتلفظ اختناق الروح في حلقه بخشونة تلفظ غ، ر، ق۔

أما الآية الثانية فتقول عن قبض أرواح المؤمنين حيث تخرج الأرواح منهم بسهولة و نعومة، الكلمتان اللتان اختار هما اللهعزوجل في هذه الآية هما سهل تلفظ و حسن النطق لا خشونة في حروفهما و ولا صعوبة،وهي 'ن، ش، ط،كأنها توحي السامع أو القارئ أن يكون قبض أرواح المومنين لينا و هينا۔

۴۔ وفي آية أخرى يقول الله تبارک و تعالى للملائكة لتعذيب المجرمين من الناس (خذوه فغلوه)

إن جرس هاتين الكلمتين و إيقاعهما يخيل المخاطب العنف والشدة لاسيما حروف خ،غ و ل المشددة۔

۵۔ (يوم يدعون إلى نار جهنم دعا) "كلمة الدع" في هذه الآية يخيل السامع أو القارئ بجرسه وظله الدفع بالعنف، يقول الأستاد سيد قطب رحمه الله عن هذا الأسلوب القرآني: هذا الدفع في كثير من الأحيان يجعل المدفوع يخرج صوتا غيرإرادي فيه عين سلكنة هكذا: (أع) و هو فيجرسه أقرب ما يكون إلى جرس (الدع)

۶۔ فذلك الذي يدع اليتيم أما الموسيقى الداخلية لكلمة (الدع) تخيل الدفع الشديد في سورة الماعون أيضا و في الحقيقة إن لكلمة (يدع) لاسيما لحرف ع المشددة إيقاع قوي من كلمة "يمنع" بنفس المعنى۔

۷۔ لاشك ولاريب والذي يتلو آية الكريمة (كلا إذا دُكت الأرض دكا دكا)أو يسمعها يتخيل في (الوسواس الخناس الذي يوسوس في صدور الناس، من الجنة و الناس)

۹۔ كل حرف من كلمةٌ نفخٌ تدل على مدلولاته بموسيقية جرسه ونغمه في الآيات الآتية: (وتركنا بعضهم يومئذ يموج في بعض و نُفخ فى الصور فجمعنا هم جمعا)۔

(و نفخ في الصور ذلك يوم الوعيد.)

(ونفخ في الصور فإذا هم من الأجداث إلى ربهم ينسلون)

(ونفخ في الصور فصعق من في السماوات و من في الأرض إلا من شاء الله ثم نفخ فيه أخرى فإذا هم قيام ينظرون).

کل حرف من کلمة "نفخ" تدل على مدلولاته بموسيقية جرسه، تلفظ حرف "ن" المضمومة لايمكن إلا بضم الفم الذى هو ينبغي لاستعداد النفخ، و تلفظ "ف" أيضا لايمكن إلا بالنفخ اليسير و إيقاع حرف "خ" يوحي بأن نفخ إسرافيل عليه السلام في الصور يكون بالغلظ و الشدة، و من الجدير بالذكر استعمال صيغة المجهول عن النفخ في الصور كما رأيناً في الآيات السالفة، هذه النكتة نرى أيضا في صيغة المضارع في سورةطه: ۱۰۲، و النمل: ۸۷، و الأنعام: ۷۳، والنبأ: ۱۸ حينما استعمل القرآن صيغة المعروف لنفخ الروح حيث يقول: (ثم سواه و نفخ فيه من روحه و جعل لكم السمع والأبصار والأفئدة قليلا ما تشكرون).

۱۰۔ (ولو فتحنا عليهم بابا من السماء فظلوا فيه يعرجون)(۲۴).

(فلما نسوا ما ذكروا به فتحنا عليهم أبواب كل شيئ حتى إذا فرحوا بما أوتوا أخذناهم بغتة فإذا هم مبلسون.

(حتى إذا فتحنا عليهم بابا ذا عذاب شديد إذا هم فيه مبلسون).

"إنا فتحنا لك فتحا مبينا"

کلمة "فتح" بنغماتها وجرسها في الآيات السابقات تدل على ما يراد بها من الفتح و دفع الستار والحجاب إلى أي شيئ ينصب الفتح إليه، إن تلفظ كل من حرف ف،ت، ح، يحتاج إلى فتح الفم كما أن هذه الحروف تشير إلى مدلولات اللفظ۔

الموسيقي الخارجية للتعبيرات القرآنية

الموسيقى الخارجية تنبعث من تآلف الحروف في الكلمات و تناسق الألفاظ في الجمل، و هي تكون من تنظيم الألفاظ الرشيقة، و انسجامها بإيقاعاتها المتسقة و نبراتها الملائمة۔ إن النوع للموسيقى الكلامية نستطيع أن ندركها و نعرف سر تأثيرها من الأوزان و القوافي و من انتظام التعبير۔

يستطيع قارئ القرآن أو سامعه أن يتذوق خلال تعبيراته الجميلة و آياته المعجزة عدة أنواع من الموسيقى الخارجية في مواضع كثيرة على سبيل المثال: (وجوه يومئذ خاشعة عاملة ناصبة تصلى نارا حامية تسقى من عين آنية۔)

"وجوه يومئذ ناعمة، لسعيها راضية، فى جنة عالية، لاتسمع فيها لاغية، فيها عين جارية، سرر مرفوعة، وأكواب موضوعة، و نمارق مصفوفة، و زرابي مبثوثة۔"

☆☆☆

ڈاکٹر احمد علی برقی اعظمی

قرآن ہے سرچشمہ فیضان وہدایت

قرآن ہے سرچشمہ فیضان وہدایت
ہے نوع بشر کے لیے جو وجہِ سعادت

دراصل ہے یہ مظہر اسرار حقیقت
ہم لوگ سمجھ کر جو کریں اس کی تلاوت

تاریکیٔ اوہام کے سب چھٹ گئے بادل
روشن ہوئی مکہ سے جو اک شمع رسالت

ہے وسعت کونین کا ادراک اسی سے
سائنس کی ایجاد اسی کی ہے علامت

جو کچھ بھی میسر ہے ہمیں اس کی بہ دولت
کرتے نہیں ارباب نظر اس پہ قناعت

تحقیق کا یہ سلسلہ ہے جاری وساری
کرتا ہے جو اسرار حقیقت کی وضاحت

جس کی شب معراج تھی اک نقطۂ آغاز
سٹلائٹ سب اس بات کی دیتے ہیں شہادت

سائنس نے اس بات کو سچ کر کے دکھایا
یہ ایک حقیقت ہے نہیں کوئی حکایت

تسخیر قمر آج کیا نوع بشر نے
قرآن میں پہلے ہی سے تھی اس کی بشارت

پیدا کیا انسان کو قدرت نے علق سے — اب اس کی بھی سائنس سے ثابت ہے صداقت

فطرت کے اشارات پہ ہم کرتے نہیں غور — حق بات ہے لوگوں کے لیے بارِ سماعت

اقبال میں تھی جرأت رندانہ مگر آج — کرتا ہی نہیں کوئی روایت سے بغاوت

ہو علمی تناظر میں جو قرآن کی تفسیر — ہو جائے گی اسرارِ حقیقت کی وضاحت

میزان کا جو سورۂ رحمٰن میں ہے ذکر — ہے ارض و سماء کی اسی محور پر عمارت

طوفان کہیں ہے تو کہیں پر ہے سنامی — ظاہر ہیں جدھر دیکھئے آثار قیامت

یہ سب ہے توازن میں خلل کا ہی نتیجہ — بے شک ہے توازن میں خلل وجہِ ہلاکت

تحقیق کا ہر ایک عمل احمد علی آج
قرآن کے ارشاد پہ ہے مہر صداقت

☆☆☆